غالب اسٹڈیز

۲

عابد رضا بیدار

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

۱۸۰۶، کلاں محل، دہلی ۲

غالب اسٹڈیز

(۲)

غالب کی عظمت

عابد رضا بیدار

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

1969

علم و فن سے آف پرنٹ

شیخ محمد اکرام کی نذر

پیشِ گفتار



غالب کی عظمت

جنوری ۱۹۶۹ء کے ایک سیمینار کی رُوداد

مرتّبہ: عابد رضا بیدار

اس سیمینار یا مذاکرہ کا خیال تو مجھے کچھ اُس وقت سے ہی پیدا ہو گیا تھا جب سرور صاحب نے ایک موقع پر غالب کی اہمیت کو ایک جملہ میں واضح کرنے کے لئے کہا تھا اور میری بے چارگی کو دیکھ کے خود اس طرح اس کی وضاحت کی تھی کہ غالب نے اردو شاعری کو ایک ذہن دیا۔ اس لفظ سے بات پوری طرح واضح ہو گئی تھی لیکن —— فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ اس مجمل کی پوری تفصیل بھی سامنے آنی چاہئے۔

شاید یہ خیال عمل کا پیرایہ نہ اختیار کر پاتا، لیکن، ایک روز ایک محفل میں: بہت عالم فاضل قسم کے ایک صاحب غالب پر اپنے زرّیں خیالات کا اظہار فرما رہے تھے اور ساتھ میں یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ اکثر لوگ ان سے غالب کے بارے میں پوچھنے کے لئے آتے رہتے ہیں، اور یہ کہ وہ کئی تقریریں بھی کر چکے ہیں۔ پھر انھوں نے یکایک ایک شعر پڑھا اور پھر کہنے لگے یہ شعر بھی غالب کے اہم اشعار میں سے ہے۔ وہ شعر میری تو گویا ساری پونجی ہی تھا، فوراً ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور پوچھا آپ کے خیال میں اس کا کیا مطلب ہے؟ شعر تھا،

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے ابھی یاں کہ مجھے کام بہت ہے

اور اس کا مطلب انھوں نے یہ بتایا کہ:

ابھی عشق و محبت میں، محبوب کے ہاتھوں ہیں کیا کیا غم نہ اٹھانے ہیں.......... ..... ابھی غموں کی انتہا نہیں ہو پائی ہے۔ تو، اے موت ابھی مجھے نہ مار، محبت کے صدمے اور سہنے دے!

میں حیران تھا کہ، ایں چہ بوالعجبی ست! میں تو اس شعر کو اس طرح سمجھا کرتا تھا کہ جب تک انسان کا مشن پورا نہیں ہو پاتا، جس نے بھی اپنے لئے کوئی مشن بنا لیا ہے، کوئی آرزو، کوئی تمنّا کا چراغ روشن کر لیا ہے، جب تک ——

اس کے دل میں اس کے لئے ایک آگ لگی ہوئی ہے جب تک اس کے لئے جگر خوں ہو کے آنکھ سے ٹپک پڑے، جدوجہد آخری حدوں کو نہ پہنچ جائے، اس وقت تک انسان موت کا بلند ہوتا ہوا ہاتھ جھٹک سکتا ہے۔ شعر میں تو موت سے محض یہ خواہش ہی کی گئی ہے کہ مجھے رہنے دے لیکن شعر کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ یہی ہے کہ موت کی جرأت ہو ہی نہیں سکتی! اس شعر کے میں نے جب وہ معنی سُنے تو یکایک خیال آیا کہ غالبؔ اچھے خاصے طبقے میں اچھا خاصا مظلوم بھی ہے، اُسے اس دھندلکے سے بھی نکالنا چاہئے۔ اور اس روز کی گفتگو ایک محرک بن گئی۔

پھر غالبؔ صدی کا ہنگامہ چلا تو یوں ہی ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ یہ جو میں کہتا رہتا ہوں کہ غالبؔ پر ادنیٰ اور اعلیٰ درجے کا (ادنیٰ زیادہ اعلیٰ کم) تحقیقی کام بہت ہوا ہے تنقیدی کام صفر کے برابر ہے، اس کے کچھ واقعی شواہد بھی مہیا کرنے چاہئیں۔ اور اگر یہ خیال غلط ہے تو اس پر نظر ثانی کرنی چاہئے اس کے لئے میں نے کتابوں اور رسالوں میں غالبؔ پر جو کچھ سرمایہ تھا اُسے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ کتابوں میں اکرام اور لطیف کے علاوہ، اور کئی ہزار تحریروں میں ۳۵-۳۰ سے زیادہ ایسے مقالوں کی تعداد نہیں بڑھتی جو غالبؔ کی تفہیم پر معیاری درجہ رکھتے ہیں، اور جن میں غالبؔ کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ سو برس میں اُردو کے مقبول ترین شاعر کو سمجھنے کے لئے سو کیا پچاس مقالے بھی نہیں آپائے۔ وجوہ جو بھی ہوں، ایک آدھ وجہ اس مذاکرہ کی روداد پڑھتے ہوئے آپ پر بھی روشن ہو جائے گی، لیکن بات اپنی جگہ اس قدر افسوسناک تھی کہ میں نے بعجلت اس مذاکرہ کا منصوبہ بنا لیا۔

ایک نشست دلّی میں ہوئی دوسری علی گڈھ میں۔ دلّی اور علی گڈھ کے جو غالبؔ شناس یا ادب پرور نام آپ کو اس میں نظر نہ آئیں اس میں میری کوتاہی کو دخل نہ سمجھئے۔ بلکہ صرف اتنا کہ چند واقعی مصروفیت کی وجہ سے معذور ادیبوں کے سوا یہ موضوع اکثر کی تو دسترس ہی سے باہر تھا! جیسا کہ ان سو برسوں میں رہا ہے۔ بعضوں نے صفائی کے ساتھ اقرار بھی کر لیا، بعضوں کو یہ آتا ہی نہیں!

دلّی کی نشست، اصل نشست کا خیال میرے مخدوم قاضی عبدالودود صاحب کی وجہ سے حقیقت کا جامہ پہن سکا؛ اور علی گڈھ کے لئے سرور صاحب محترم کام آئے۔ ایسے ہی موقعے آجاتے ہیں کبھی کبھی، جب انسان کی شرافت و عظمت پر ایمان و ایقان تازہ ہو جاتا ہے۔ اور کچھ بھی نہ ہو پایا ہو تو میرے لئے یہی سرمایۂ جان کیا کم ہے۔

ملا صاحب نے صدی سیمینار میں اسی موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ اور سید حسن صاحب، یوسف صاحب، رشید صاحب اور ڈاکٹر مختار الدین احمد جو سیمینار میں نہیں آسکے تھے انھوں نے میری درخواست پر الگ سے اظہارِ خیالات کیا اور اس طرح ہماری محفل میں شریک ہو گئے۔

سیمینار کا آغاز راقم کے مقالے سے ہوا تھا جو خاص طور سے اسی موقع کے لئے لکھا گیا تھا اور جس میں مثبت طور پر غالبؔ کی عظمت کا ایک تصور بھی پیش کیا گیا تھا اور ساتھ ساتھ متعدد سوالات بھی چھیڑے گئے تھے؛ اسی سے بحث کا آغاز ہوا۔

امید ہے یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا، اور غالبؔ کی تفہیم کے سلسلے میں آئندہ ایک تاریخی یادگار بن جائے گا جس سے آنے والی نسلیں آزادی کے بائیسویں سال میں ہندوستان کے ممتاز ترین اردو دانشوروں کے شعور اور ذہنی سطح کو ناپ سکیں گی ▲▲

مقالۂ افتتاحیہ

عابد رضا بیدار

(۱)

غالب کی عظمت کا ایک پہلو تو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اُردو کے کتنے ہی معیاری شعری اور نثری مجموعوں کے نام غالب کے کسی نہ کسی شعر میں مستعمل ترکیب سے ماخوذ ہیں۔ یہ بات غالب کی عظمت کے اعتراف سے قطع نظر اس بات کی بھی دلیل ضرور ہے کہ اس ترکیب، یا زیادہ صحیح، غالب کے اس ترکیب کے استعمال میں اتنی وسعتِ ظرف ضرور تھی اور ہے کہ وہ نت نئے موقعوں پر استعمال کی جاتی رہے پھر غالب کے مصرعوں اور شعروں کو کتنی متنوع جگہوں پر کیسے خوبصورت پیرایوں میں نثر نگار استعمال کرتے رہے ہیں جو ان حصوں کو اتنا دل آویز بنا دیتے ہیں کہ مستعملہ شعر یا مصرع ہٹا کے پڑھا جائے تو بالکل بے جان ہو کے گر پڑیں۔ یہ بھی اس امر کی

دلیل ہے کہ اس مخصوص شعر میں ایسے امکانات چھپے ہوئے تھے کہ وہ اس نئے موقع پر بھی بخوبی استعمال میں آسکا۔

لیکن اس بات کا ایک پہلو اور بھی ہے جسے اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے!

وہ یہ کہ، ممکن ہے یہ غالب کی عظمت کی دلیل نہ ہو بلکہ استعمال کرنے والے کے حسنِ ذوق اور حسین اسلوب کا ایک مزید (DIMENSION) ہو! کہنے اور سننے والے کے درمیان ایک رشتۂ ارتباط اور رشتۂ تفہیم قائم ہے: ایک ہی زمانے اور قریب قریب ایک ہی ذوق کے حامل ہیں دونوں! ایک سے مسئلوں سے دوچار ہیں۔ اب ایسے میں اگر کسی شعر کا برمحل استعمال ہوجاتا ہے تو وہ اس شعر کی خوبی دوسرے درجے پر ہے، پہلے درجے پر استعمال کرنے والا آتا ہے۔

یوں استعمال میں آنے کو تو، یہ خالص غزل کا شعر ہے:

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے   کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

لیکن دسیوں بار میں نے اسے اتنے مختلف النوع مواقع پر ایسی مناسبت کے ساتھ استعمال ہوتے دیکھا ہے کہ غالب کے بھی کم ہی اشعار اس کیفیت کو پاسکے ہیں۔ اور اس شعر میں تو پھر ایک انداز تھا جس نے اُسے وسعتِ ظرف بخش دی لیکن یہ شعر:

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں مری مان جائیے
اللہ! تیری شان کے قربان جائیے

اور یہ مصرع اپنی ادھوری صورت میں:

سینہ کس کا ہے! (مری جان جگر کس کا ہے)

(جس کا پہلا مصرع یوں ہے: تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے؟) ایسے اچھے موقعوں پر آیا ہے کہ غالب بھی حسرت کھینچیں استعمال میں آنے کی بات زیادہ آگے چلے تو پھر داغ کو اردو کا سب سے عظیم شاعر قرار دینا پڑے گا، جس کے شعر سیاسی اور سماجی مسائل پر کتنی ہی جگہ ایسے بے اختیارانہ یاد آجاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اصل میں انھیں موقعوں کے لئے کہے گئے تھے۔ جب کہ داغ بے چارے کے تصور میں بھی نہ ہوگا کہ اس کے خالص عاشقانہ (اور حسرت کی اصطلاح میں فاسقانہ!) شعر کے اتنے عظیم پہلو بھی نکل آئیں گے۔

اسی مندرجہ بالا بحث کا ایک پہلو غالب کے اشعار کے بجنوری معنی (اور شاید حالی معنی بھی!) ہیں، جن میں اونچے سے اونچا فلسفہ اور بلند سے بلند خیال تہ در تہ غالب کے دو مصرعوں میں سمویا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ بجنوری غالب سے زیادہ ذہین، تربیت یافتہ، اور، پڑھے لکھے آدمی تھے! اور یہ کہ غالب کے شعر کے پردے میں اکثر انھوں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

یہ نکتہ کچھ اہلِ ایمان کو گراں گزرے گا لیکن کہوں گا ضرور (مثال سے مقابلہ مقصود نہیں ہے) کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں مولانا آزاد نے جو کچھ کہا ہے اس سے دس گنا تو میں بھی اس کے مطالب بیان کرسکتا ہوں! لیکن کیا یہ سب، اور وہ سب، واقعی الحمد کے مطالب ہوں گے یا ابوالکلام اور عابد رضا بیدار کی ترجمانی! اسی طرح یہ اشعار کی بات ہے۔ اور اس لئے یہ غور طلب امر ہے کہ کیا واقعی ان اشعار کے اتنے ہی مطالب ان شاعروں کے ذہن میں رہے ہوں گے! اور کیا، یہ شاعر سے زیادہ خود غزل کی صنف کی خوبی نہیں ہے!! اور کیا اس میں اس شعر کو استعمال کرنے اور ترجمانی کرنے والے کا ذرا سا بھی رول نہیں ہوتا اور وہ محض ایک واسطہ ہوتا ہے شاعر کا شعر آپ تک پہنچا دینے کا!!!

○

کچھ باتیں صفائی کے ساتھ مان لینی چاہئیں تا کہ بعد

کے آنے والے الجھاؤ پریشان نہ کریں:

یہ کہ، غالب کی اہمیت، مقبولیت یا عظمت جو کچھ بھی اور جس درجہ کی بھی ہے وہ نوے پچانوے فی صدی اس کے اُردو کلام کی وجہ سے ہے۔ یہ نہیں کہ فارسی کلام کم پایہ ہے؛ بلکہ بس یہ کہ فارسی ذوق کی بتدریج کمی کے سبب نہ تو وہ عوام تک پہنچ سکا نہ خواص تک۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ فارسی کلام پڑھا ہی نہیں گیا، یا یہ کہ وہ اس کی عظمت کا باعث نہیں ہے؛ بلکہ صرف اتنا کہ اس کی عظمت کو استوار کرنے میں اُسے بنیادی درجہ حاصل نہیں ہے، صرف قائم شدہ نقش کو مزید مستحکم کرنے کا رول اُسے ملتا رہا ہے۔ اور یہ فارسی ذوق کی کمی کی کچھ آج ہی کی بات نہیں؛ حالی کے زمانے میں اور ان کے بعد بھی، لوگ اُردو غالب کو پڑھنا پسند کرتے تھے؛ شرحیں بھی اُردو کلام ہی کی سامنے آتی رہیں، اور مقالوں میں بھی اسّی فی صدی سے زیادہ غالب کے اردو کلام ہی کی تشریح و توضیح ہوتی رہی۔

یہ کہ، خطوط بھی غالب کی عظمت کے ستون نہیں؛ بس اس کے اشعار کو سمجھنے میں مددگار، اس کے ماحول میں پہنچنے کا ذریعہ، اس کے صاحب طرز ہونے کی دلیل ہیں اور سب سے بڑھ کے اس کے بھرپور آدمی ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں؛ زندگی کے ہر پہلو سے لطف اندوز ہونے والی شخصیت کے ترجمان! جو کسی بھی جگہ نہ اپنے زمانے سے ستیزہ کار ہے نہ اپنی ذات سے!! ان خطوط نے اردو کلام کہنے والے غالب کو سمجھنے میں مدد دی ہے، اور عظمت کے نقش کو اور گہرا کر دیا ہے۔ بنیادی درجہ بہرحال انھیں حاصل نہیں ہے۔

اور آخری بات یہ کہ، اگر وہ واقعی بڑا شاعر ہے، تو کس قسم کی عظمت ہے اس کے شعر میں؟ عظیم سعدی یا رومی کی عظمت ــــ ہومر یا شکسپیر کی عظمت ــــ اس سے کمتر درجے کی حافظ والی عظمت ــــ یا اپنے ماحول اور غزل کی صنف میں دوسرے تمام ہم عصروں سے نکلتی ہو قد آور شخصیت والی عظمت!

○

عظمت کے لفظ سے بدکنے یا اس پر بپھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا استعمال ہمیشہ اور ہر جگہ اضافی طور سے ہوتا رہا ہے۔ یہی اضافی استعمال یہاں بھی ہے۔ عظمتِ مطلق بھی کہیں نہ کہیں پہنچ کے شاید پھر اضافی بن جائے، تاہم اس کے لئے خالص دنیاوی پیمانہ تو بہت سادہ طور سے ایک ہی ہو سکتا ہے کہ: وہ جس کے نام اور کام سے میں اور آپ واقف ہیں، لیکن جو میرے آپ کے نام سے متعارف نہیں ہے، وہ "مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے" یہ جواہر لال اور جناح، خلاً سب سے اوپر کے حلقہ میں، لتا اور دلیپ کمار ایک اور حلقہ میں، پٹودی اور حسین ایک اور حلقہ: یہاں بیکراں وسعت ہے! ادب کی طرح محدود دنیا نہیں۔ پھر ادب بھی کسی عالمی زبان کا نہیں، اردو زبان کا ادب جو مشرق کی ترقی پذیر زبانوں میں شاید سب سے کم عمر زبان ہے؛ کمپنی کے ملازموں کی تعلیم کے سلسلے میں بعض مبارک و محمود کوششوں کے ماسوا عہد جدید سے قبل جس کے ترجمے تک کسی بیرونی زبان میں نہ ہو سکے، اِلّا ماشاء اللہ! اور اب بھی علوم اسلامیہ کے ماہروں نے ایک اقبال میں دلچسپی لی، اور برادری کے ناتے سوویت حلقہ نے ترقی پسندوں کو متعارف کرا دیا؛ باقی اب بھی کیا ہے۔

تو غالب کی عظمت کو ان سب حدود و حالات کی روشنی میں سمجھنا ہے؛ اسی لئے میں نے عظمتِ اضافی کی بات رکھی ہے۔

عظمت کا یہ لفظ اضافی کے ساتھ ساتھ نسبتی بھی ہے،

غالب پسندوں کے مختلف LAYERS ہیں اور ہر LAYER پر، مثال کے طور پر وہ غزل جسے میں غالب کی بہترین غزل قرار دیتا ہوں، ایک ہی طرح اس کے مرتبہ کی تقدیر ہو، یہ قطعی ضروری نہیں ہے۔ بعض اُسے ادنیٰ درجہ دیں گے، بعض اوسط، اور بعض اعلیٰ۔ اسی نسبتی اضافیت کا ایک دوسرا پہلو نادان دوستی بھی ہے جس کی تشریح کی ایسی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔

ایک جگہ غالب اس لئے عمدہ شاعر ٹھہرے گا کہ اس نے ایسے ایسے شعر کہے ہیں:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ایک سطح پر وہ اس لئے اہم شاعر ٹھہرے گا کہ اس نے حاجت الورود باتوں کو انتہائی خوبی کے ساتھ شعر میں ڈھال دیا ہے اور، بقولے، نفسیاتی ژرف نگاہی وغیرہ کا ثبوت دیا ہے۔

ایک سطح پر اس کے فن کی تعریف ہوگی جس میں کہیں پہلوداری پر زور دیا جائے گا کہیں سہل ممتنع پر:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ایک طبقہ ان کی اس بلند خیالی بلکہ نازک خیالی کی داد دے گا کہ:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے مسجود اپنا
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما جانتے ہیں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ایک سطح پر اس کی مشکل پسند طبیعت کو سراہا جائے گا کہ:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

یا نوناسخیت کو:

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

ایک طبقہ ایسے اشعار پر کھلکھلا اٹھے گا کہ غالب تو یہ ہے:

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ایک جگہ اس کی طرح دار ترکیبوں کی داد دی جائے گی:

ع مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
ع خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
ع سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا
ع جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

ایک جگہ اس کے اسلوبِ بیان کے ان پہلوؤں اور ان مضامین کی تعریف ہوگی جو فارسی کے کلاسیکی شعرا کا عطیہ ہیں؛ دوسری جگہ اس کے پینترے کے آرٹ کی مداحی ہوگی جو

اس میں شک نہیں خاصا لطف دیتا ہے:

ع ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کبھی ....

ع واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے

(کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار ہے

لیکن کیا یہ ساری خصوصیات کہیں یکجا اور کہیں فرداً فرداً غالب کے پیشرو مصحفی، غالب کے معاصر ذوق اور مومن، اور غالب کے بعد آنے والے داغ میں نہیں مل جاتیں؟ تو پھر غالب کی عظمت کے ستون کہاں ہیں؟ یا کہیں بھی نہیں؟؟

اس کی عظمت کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ غزل کی تہذیب کا بھرپور نمائندہ، اردو سماج کی فکری سطح کو بلند کرنے والا، اشیاء اور مسائل پر غور کے لئے کچھ نہ کچھ جگر کاوی کرنے والا —— اور نتیجہ میں، اردو شاعری کو سوچنے والا ذہن عطا کرنے والا شاعر ہے: وہ جو اردو تہذیب کی تاریخ میں پہلی بار تذبذب اور تشکیک سے دوچار ہوا، اور روایات کے گھور اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کے آگے بڑھا۔ اس نے یہ شعر محض تفریحاً نہیں کہے تھے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

'ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر'، وہ شاید عمر بھر اس مرحلہ سے دوچار رہا!

دوسرے یہ کہ اس نے خالص عشقیہ شاعری بھی کی ہے تو بڑے درجہ کی۔ بڑی عشقیہ شاعری اور بڑی فکریہ شاعری کی سرحدیں کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں: ایک میں جذبہ نسبتاً حاوی رہتا ہے، دوسرے میں فکر، لیکن میل دونوں جگہ دونوں کا ہوتا ہے:

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

ع قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

ع ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

تمثال جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک
آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

اور تیسرے یہ کہ محض فن کو پیش نظر رکھا جائے تو یہاں بھی غالب نے اسلوب شعر کو اتنے گوناگوں تجربوں سے متعارف کرایا ہے جو کسی ایک جگہ، تنہا کسی ایک

[1] یگانہ (غالب شکن) اور عندلیب شادانی (تحقیقات) نے ایسے اشعار کی ایک طویل فہرست دی ہے جو عرفی، نظیری، سعدی، خیام، اور بعض کم معروف شعرائے فارسی سے بھی ماخوذ ہیں۔ یہاں انھیں دہرانا ضروری نہیں۔

شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔

اور ان تینوں امور سے ہٹ کے، اپنی جگہ پر، اس کی عام مقبولیت بھی اس کی عظمت کی بنیاد نہ سہی اس کا اہم ستون تو یقیناً بن ہی جاتی ہے، وہ جو عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی سے بھی زیادہ عام زندگی کا حصّہ بن گیا ہے:

ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
ع ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
ع یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
ع کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
ع آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
ع ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

ایسے کتنے ہی شعر اور مصرعے ہیں جو خطوں میں، باتوں میں، تقریروں میں ہر سطح کے لوگ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ غالبؔ ہماری روز مرّہ کی زندگی کا ایک جزو سا ہو گئے ہیں اور کتنی ہی متوقع اور غیر متوقع جگہوں پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ مولانا آزاد اور رشید صدیقی غالبؔ کے اشعار کو سلیقہ سے استعمال کرنے میں خاصے معروف ہیں لیکن یہی دو نہیں، اردو کے کم طرح دار ادیب ہوں گے جنھوں نے کسی نہ کسی جگہ غالبؔ سے کسبِ فیض نہ کیا ہو۔ غالباً رتن ناتھ سرشار سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جنھوں نے اپنی اولیں تصنیف (تقریظ قندیلِ حرم) میں غالبؔ کے انتقال کے ۴ سال بعد غالبؔ کے اشعار استعمال کئے۔ پھر مولانا آزاد اور مولانا محمد علی نے الہلال اور ہمدرد میں بلا مبالغہ سیکڑوں بار ان کے اشعار کو رنگ رنگ سے اپنی نثر میں سمویا۔ اور رشید صدیقی نے تو گویا غالبؔ کو اپنی تحریروں کی رگوں میں دوڑتا لہو بنا لیا۔ بعد میں آنے والوں نے گنجہائے گرانمایہ، زود پشیماں اور محشرِ خیال کے بعد کی نسل نے، جو اقبال کے اثر سے کسی طرح بچ نکلے، نقشِ فریادی، ناخن کا قرض، گل نغمہ، شہرِ آرزو، کاغذی پیرہن، نمرود کی خدائی، کہتے ہیں جس کو عشق، قسم کے اپنے مجموعوں کے نام رکھ کر غالبؔ کے فیضان کا اعتراف کیا!

یہ دونوں امور غالبؔ کی اثر پذیری سے ہٹ کے ایک اور پہلو کو بھی پیش کرتے ہیں: یہ کہ، غالبؔ نے ہماری تہذیب کے رچاؤ کے اتنے متنوع پہلوؤں کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیا ہے کہ کہیں نہ کہیں، زندگی کے کسی نہ کسی مرحلہ پر، اگر غالبؔ سے ہماری تھوڑی بہت بھی شناسائی ہے تو، یہ ناممکن ہے کہ ہم اس سے کبھی بھی ٹکرائیں نہیں! ایک شریف، بردبار، علمِ مجلسی سے واقف، شستہ، شائستہ، ہر رنگ میں وا، متین و ثقہ حلقوں میں سنجیدہ، ٹھٹھول بازوں میں سوا ٹھٹھول باز، زندگی کے رس کو پوری طرح نچوڑ کے پی جانے اور اس سے متنفر نہیں سازگر لینے والی بڑی متوازن بے ابال، اپنے سے ہم آہنگ شخصیت کا ہیولیٰ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی موڑ پر ابھر آتا ہے: یہ میں ہوں، مرزا نوشہ! اسد اللہ خاں غالبؔ۔ مجھے نہیں پہچانتے؟ نہ سہی، میرے جگر کے ٹکڑوں کو تو پہچانتے ہو، وہ تمہیں مجھ تک لے آئیں گے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے عوامی یا عوام پسند یا مقبول عام اشعار کسی بھی شاعر کو عظمت کا تاج نہیں پہنا سکتے، لیکن جب یہ شعر اردو سماج کی رگوں میں دوڑتے پھرتے خون کا درجہ لے لیں تو اس بات کا ثبوت تو ہے ہی کہ شاعر عوام کا حصّہ بن چکا ہے۔ اور کیا یہ عظمت کا ایک پہلو نہیں ہے؟ اور دانشوروں نے اس کے اشعار کو اپنی تحریروں

ہی کا نہیں افکار کا بھی جزو یقیناً بنایا ہوگا۔ عبارتوں میں غالب کی پیوند کاری اور اہم مجموعوں کے اس سے ماخوذ نام، بات یہیں پر ختم نہیں کر دیتے: یہ اشعار کسی تیسرے درجہ کے مردہ سماج کو بھی زندگی کی حرارت بخش سکتے ہیں: غالب کے فوراً بعد جو اردو سماج بنا وہ تو پھر بڑا زندہ، توانا، سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو سے سرشار، ماضی پر مغرور، حال سے گریزاں اور مستقبل بیں، لیکن سلح تھا۔ سرسید اور حالی، آزاد اور اقبال، محمد علی، انصاری اور اجمل خاں، ذاکر حسین اور رشید صدیقی، سہیل اور اصغر، فیض اور فراق، مودودی اور دریابادی، اہم اکابرین سے کون ہے اپنی ذہنی زندگی کے تشکیلی دور میں جس نے غالب سے کسب فیض نہیں کیا۔ ان سب کے یہاں اس کے شواہد موجود ہیں۔ ان بڑے سماجی اور ذہنی معماروں کا معیار اعلیٰ کیا آپ کے خیال میں عظیم نہیں ٹھہرے گا؟

مجھے اصرار ہے کہ ان کی، اور پھر اب موجودہ نسل کی فکر کے اجزائے ترکیبی میں اس قسم کے اشعار کی تہ میں کام کرتی ہوئی سوچ بھی شامل رہی ہے میں مجبوری کی مانند ان کی وضاحتیں نہیں کروں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اشعار میں ایسے ذاتی معنی موجود ہیں کہ انھیں کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف انھیں پڑھے دے رہا ہوں: (یا زیادہ سے زیادہ غالب ہی کے یہ چار شعر پہلے سنا دوں گا جس سے شاید یہ بات واضح ہو جائے کہ غالب کے پاس اپنی ذاتی پونجی بھی تھی:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے)

یہ ہیں وہ شعر جن میں مرکزی خیال آرزوئے نایافت، دل کو خوں کرنے کی فرصت کی خواہش، خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکنے کی تمنا، رونقِ ہنگامہ، انجمنِ آرزو، شوقِ فضول اور جرأتِ رندانہ سے عبارت ہے:

عمر ہرچند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے ابھی یاں کہ مجھے کام بہت ہے

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اور، مزید وضاحت کے لئے میں تینوں قبیل کی ایک ایک نمائندہ غزل پیش کر رہا ہوں۔ پہلی غزل میں غالب کے عوام پسند پہلو بڑی وضاحت اور رنگا رنگی کے ساتھ ایک جگہ آگئے ہیں اور اسی لئے اس غزل کے بیشتر حصّے، مصرعے یا شعر خاصے مقبول بھی ہیں :

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو اگر بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں، رکھیئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

دوسری غزل میں ان کے عشقیہ انداز کی بہت اچھی ترجمانی ہو گئی ہے :

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی!

اور، اُردو شاعری کا سوچتا ہوا ذہن پوری طرح اس ایک غزل میں نمودار ہوتا ہے جس میں اس کی فکر کا بنیادی خیال بھی بار بار پلٹ پلٹ کر آتا ہے؛ اور، پھر، کچھ دوسرے اہم ترین پہلو بھی :

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

تب نازِ گراں مایگیٔ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستم گر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہ ہو، گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ ناداں
جب اک نفس اُلجھا ہوا، ہر تار میں آوے

آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

روداد

عابد رضا بیدار، ۱
آل احمد سرور، ۲
خلیل الرحمٰن اعظمی، ۳
نعمان احمد صدیقی، ۴
وحید اختر، ۵
حسن عسکری، ۶
وارث کرمانی، ۷
شہریار، ۸
کوثر چاندپوری، ۹
سیّد اوصاف علی، ۱۰
سیّد امیر حسن عابدی، ۱۱
عبداللطیف اعظمی، ۱۲
بیگم صالحہ عابد حسین، ۱۳
عبدالخالق نقوی، ۱۴
سیّد عابد حسین، ۱۵
مالک رام، ۱۶
مختار الدین احمد، ۱۷
رشید احمد صدیقی، ۱۸
یوسف حسین خاں، ۱۹
آنند نرائن مُلاّ، ۲۰
آل احمد سرور، ۲۱
خواجہ غلام السیّدین، ۲۲
قاضی عبدالودود، ۲۳

الفاظ کے اُوپر لکیر کا مقصد یہ ہے کہ کہنے والے نے یہ لفظ زور دے کر ادا کیا ہے۔

ــــ یہ ایسی طویل لکیر جو جملہ معترضہ کے لیے استعمال ہوتی چلی آئی ہے، میں نے ایسے لئے رکھی ہے جہاں کہنے والے نے بات ادھوری چھوڑ دی ہے یا منطقی سلسلہ ٹوٹ گیا ہے۔

[ ] یہ بریکیٹ اس بات کے اظہار کا ہے کہ اصل گفتگو کرنے والے کے علاوہ یہاں کسی اور کا سلسلۂ گفتگو ہے۔

ظل عباس عباسی: میں سب سے پہلے اس بات کی وضاحت چاہوں گا کہ عظمت سے مقالہ نگار کی کیا مراد ہے؟

نعمان احمد صدیقی: میں یہ بات پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کا مطلب عظمت سے غالب کی شاعری کی عظمت ہے یا شخصیت کی، یا مجموعی طور سے؛ یا کن چیزوں سے؟

آل احمد سرور: بھئی، غالب کی شاعری کو جو عظیم سمجھا جاتا ہے، آپ کا مطلب جو ہے وہ یہ ہے کہ اس کی کیا وجوہ ہیں آپ کے نزدیک، آپ کے نزدیک، آپ کے نزدیک ظاہر بات ہے کہ بہت سی چیزیں مشترک ہوں گی، بعض چیزوں میں فرق ہوگا۔ بنیادی چیزوں کو معرض بحث میں آنا ہے۔

نعمان احمد صدیقی: ان کی شخصیت ـــــ یعنی بڑائی کس میں ہے، یہ بات صاف ہونی چاہئے۔ یعنی آدمی بڑا ہو سکتا ہے شاعری (بڑی) نہیں کرتا ہے، ایک آدمی کی شاعری بڑی ہے آدمی ـــــ تو اس کی وضاحت

مرتب: یہ بھی سب آپ ہی کو واضح کرنا ہے۔

آل احمد سرور: یہاں اس شخصیت سے بحث نہیں ہے۔ اس شخصیت سے بحث ہے جو شاعری میں آئی ہے یہ بات واضح رہنی چاہئے! ۵۵



آل احمد سرور

(۲)

میں جو ادب کا مطالعہ کرتا رہا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ادبیات کی تاریخ میں مجموعی طور پر، اور تہذیب کی تاریخ میں بھی، [illegible] رہا ہے سلسلہ، مذہبیات سے! یا یوں کہئے کہ کسی نہ کسی طریقہ سے ایک پُراسرار غیبی طاقت سے وابستگی! اور اسکے بعد رفتہ رفتہ تہذیب و تمدن میں بھی، اور ادبیات میں بھی ایک دنیوی رنگ آیا۔ اس کو ہم انگریزی میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ سیکولرائزیشن SECULARISATION آیا۔ تو میرے نزدیک جیسے جیسے تہذیب کا ارتقا ہوتا گیا ہے، اور ادبیات میں ترقی ہوتی گئی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ SECULARISATION یا دنیوی پہلو، مختلف منزلوں سے گزرتا ہے اور اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مذہبی پہلو کو نظر انداز کرتے ہیں یا اس کو اہمیت کم دیتے ہیں؛ لیکن مراد جو ہے وہ تہذیب کے ارتقا کو، ادبیات کے ارتقا کو، ملحوظ رکھنے سے ہے۔ تو یہ بات میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ اگرچہ بڑی شاعری مذہبی بھی ہوئی ہے، اور بڑی شاعری اور بھی بہت سے پہلوؤں میں ہوئی ہے؛ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جذبے کی شاعری ہوتی ہے اس میں بھی بڑائی آجاتی ہے، خالص فکر کی شاعری کافی نہیں ہے جب تک کہ وہ جذبہ کی آمیزش کے ساتھ نہ ہو؛ لیکن جب ہم بڑائی دیکھتے ہیں، تو مجموعی طور پر، جہاں تک کہ اردو کا معاملہ ہے، اب ظاہر بات ہے کہ میں بات کو جو کہہ رہا ہوں تو واضح کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سَو فیصدی یہ بات ایسی ہی ہے؛ یا حرفِ آخر ہے؛ بلکہ میلان کہنا ہے ——

میرؔ کو میں بڑے شاعر ہیں۔ اور عشقیہ شاعری میں اُنکی بڑائی موجود ہے۔ اور وہ عشقیہ شاعری جو ہے اس میں صرف عشق ہی نہیں ہے، اور بھی چیزیں ہیں، اور اس وجہ سے بڑائی بھی ہے۔

نظیرؔ ہیں، ان کے یہاں بڑی وسعت ملتی ہے۔ اور اپنی

تہذیب کا بڑا سچا عشق ملتا ہے۔ انیس کے یہاں حق و باطل کی کشمکش، ایک خاص انداز سے آئی ہے؛ اس کا بہت بڑا اخلاقی پہلو ہے، انسانی پہلو ہے۔ بعد میں ہم دیکھتے ہیں اقبال ہیں، جن کے یہاں بڑی شاعری ملتی ہے۔ اور اس سے ہٹ کے ایک بڑی مذہبی فکر بھی ہے۔ لیکن، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جو نام میں نے لئے ہیں: میرؔ اور انیسؔ اور اقبالؔ اور سوداؔ، اور اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں، تو ان سب میں غالب کو ایک امتیاز حاصل یہ ہے کہ ان کے یہاں اردو شاعری صحیح معنوں میں جسے میں نے SECULARISATION یا دنیوی رنگ کہا ہے، اس کے ایک نقطۂ عروج کو ظاہر کرتی ہے، اپنے دور کے! اور اس کو میں اس طرح واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی اپیل (APPEAL) غالباً اردو کے سب شاعروں سے زیادہ ہے! تمام مذاہب کے اور تمام مختلف مسلکوں کے رکھنے والوں کے، اور تمام سیاسی عقیدوں کے، ان سب کے مقابلے میں زیادہ ہے!! اسلئے کہ ان کے یہاں وہی بات ہے کہ جو شیکسپیر میں ہے، کہ زندگی کی پہنائیوں پر ان کی نظر ہے، ہمہ گیری ہے ان کے یہاں اور آپ چاہیں تو ان کے یہاں رجائی پہلو کے اشعار نکال سکتے ہیں؛ چاہیں تو، قنوطی پہلو کے اشعار نکال سکتے ہیں؛ چاہیں تو، عشقیہ شاعری کے اشعار نکال سکتے ہیں؛ چاہیں آپ تو، ان کے یہاں محض ایسے اشعار نکال سکتے ہیں جو تصوف کے ہیں لیکن یہ ہمہ گیری اور جامعیت جس میں کہ ہماری دنیوی زندگی مذہب سے اثر قبول کرتی ہے، پھر اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی ہے، یہ غالب کے یہاں جس شان سے نظر آتی ہے، وہ میرا خیال ہے کہ کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اس کو میں ایک اور طریقے سے واضح کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ:

یہ جو اُن کی ہمہ گیری اور جامعیت ہے اس کو آپ چاہیں تو ایک اور لفظ سے سمجھ سکتے ہیں جس کو ہم ارضیت کہیں گے؛ یا انگریزی میں THIS WORLDLINESS اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ THIS WORLDLINESS جو ہوتی ہے اس میں OTHER WORLDLINESS سے بھی رشتہ ہوتا ہے، لیکن جو زور ہوتا ہے وہ اس کی طرف ہوتا ہے کہ اب نظر دنیا کی طرف ہے: دنیا کی طرف، اور آدمی کی طرف! اور آدمی کے سلسلہ میں میں اُن کا وہ شعر پڑھتا ہوں جو میرے نزدیک اہمیت رکھتا ہے، بظاہر بہت اچھا شعر لوگوں کو نہیں معلوم ہوتا ہے جس میں وہ بات خاصی جامعیت کے ساتھ کہہ دی گئی ہے:

ع بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ جو انسانیت کی تلاش ہے، یہ اپنی جگہ پر کتنی ہی برگزیدہ سہی، لیکن آدمی کو تسلیم کرنا اور آدمی کے امکانات سے، اس کی خوبیوں سے، خامیوں سے واقف ہونا، یہ معمولی بات نہیں ہے۔ تو، غالب کے یہاں یہ جو عظمت ہے، اس کا راز میرے نزدیک پہلے تو اس چیز میں ہے ان کے یہاں جو ارضیت ہے جہاں کہ دنیوی زندگی اپنی ساری رنگینیوں اور رعنائیوں اور بلندیوں کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔ اسکے ساتھ جیسا کہ آپ نے اس کا حوالہ بھی دیا ہے، جب میں یہ کہتا ہوں کہ غالب نے اردو شاعری کو ایک ذہن دیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ذہنی کیفیت پہلے نہیں ملتی ہے؛ بلکہ یہاں شاعری کی عظمت کی بنیاد جو ہے، وہ اس فکر پر ہے جس میں کہ جذبے کی آنچ موجود ہے۔ محض فکر شاعری میں اہمیت نہیں رکھتی ہے جب تک کہ وہ جذبہ بن کر نہ آئے۔ اس کو آپ انگریزی کے ایک مشہور فقرہ FELT THOUGHT سے ادا کر سکتے ہیں۔ اب یہ THOUGHT جو ہے، یہ جیسے نسخہ حمیدیہ کے اشعار میں ذہنی شق بھی ہے، محض خیال بلندی بھی ہے لیکن بہت بڑی حد تک، ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری میں، دیوان کے اشعار میں، اور نسخہ

حمیدیہ کے کچھ اشعار میں بھی، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے متعلق ایک حکیمانہ نظر ہے اور اس حکیمانہ نظر میں بڑی وسعتِ نظری بھی ہے اور وسعتِ قلب بھی۔ اور اس میں جو اظہار ہوا ہے وہ استعاروں میں ہوا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ 'استعارہ' بھی ان کا اہمیت رکھتا ہے، جو کہ محض مشابہت دکھانے کے لئے یا آرائشی پہلو کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ آپ کے سامنے ایک ذہنی دنیا لاتا ہے۔ آپ نے جن LAYERS کا ذکر کیا ہے تو وہ LAYERS بھی، اگر اہمیت رکھتے ہیں تو اس لئے اہمیت رکھتے ہیں کہ ہم ان سے صرف مشابہت یا فرق نہیں دیکھ لیتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ معنی کی ایک دنیا میں پہنچ جاتے ہیں:

تو اور آرائشِ خمِ کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یہاں صرف گویا کہ مشابہت اہمیت نہیں رکھتی ہے؛ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہم جو اس کی، بہت سی مماثلتیں یا بہت سی چیزیں تلاش کر لیتے ہیں، وہ بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے لئے، غالب نے مروجہ زبان پر قناعت نہیں کی؛ بلکہ یہ جو تیاری تھی نسخۂ حمیدیہ میں یہ اصل میں اپنی زبان بنانے کی تیاری تھی۔

تو میرے خیال میں، غالب کی عظمت کا جو راز ہے وہ پہلے تو اس پہلو میں ہے کہ انھوں نے 'جو ادبیات کا ارتقاء ہے اس کے راز کو پا لیا تھا؛ اور، ارضیت ان کے یہاں ہماری اُردو شاعری میں سب سے پہلے بڑی شان سے نمودار ہوتی ہے، جس میں کہ آدمی کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، اور جس میں کہ آدمی کی زندگی کا ہر پہلو اہمیت رکھتا ہے اور، وہ ایک خاصی پختہ نظر کی دلیل ہے جس میں کہ ایک بلند تخیل کبھی تو بعض انکار لیتا ہے اور کبھی اپنی شوخی کی مدد سے ہر مسئلے پر اظہارِ خیال کرتا ہے؛ اور اس کے یہاں کہیں کسی چیز میں کوئی مماثلت نہیں ہے، کہ کبھی، یہ چیز جو ہے، اس پر ہم اظہارِ خیال نہیں کریں گے

تو یہ جو ذہن کی شوخی ہے اور خلاقی ہے، اور یہ وسیع المشربی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اُس کی آدمی کو اُس کے ہر رنگ میں پہچاننے کی کوشش کی ہے، اور اس کے لئے روایت سے استفادہ کرتے ہوئے روایت پر قناعت نہ کرنا، اور اپنی راہ نئی نکالنا، یہی میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سب سے بڑا کمال ہے۔

اس کے سلسلے میں جب ہم اس کی زبان کا ذکر کرتے ہیں تو یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے، اس طرف لوگوں نے توجہ نہیں کی ہے، کہ اس کے کئی سو اشعار ایسے ملیں گے جن میں کہ ہم ایک ترصیع پاتے ہیں۔ یہ ترصیع اُس قسم کی نہیں ہے جیسی کہ صنائع میں خوبی سمجھی جاتی ہے، بلکہ ہموزن الفاظ بھی ہیں؛ اور وہ ہموزن الفاظ، مل کر ہم کو مجموعی طور پر جو کیفیت عطا کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا کلام گنجینۂ معنی کا طلسم ہی نہیں تھا، بلکہ لفظ جو تھا وہ صحیح معنوں میں تخلیق کرتا تھا ایک جہانِ معنی کو! اور، اس لئے، وہ شاعری کے آداب سے جتنا واقف تھا شاید اتنا کوئی اور واقف نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں جتنا اثر غالب کا ہے اتنا کسی اور کا نہیں ہے۔ اور صرف معاملہ یہی نہیں ہے کہ بعض مشہور ادیب اس کے اشعار استعمال کرتے ہیں! بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال کا وجود نہ ہوتا!! اور نہ فانی کا وجود ہوتا!!! اور یہ رنگ الگ الگ ہیں لیکن، بہت سی چیزیں ایسی ہیں اقبال کی، اگر آپ دیکھئے: ان کی شوخی؛ وہ بیشتر غالب سے لی گئی ہے۔ اور نثر میں بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں، حالانکہ نثر تو ہمارے موضوع سے خارج ہے، کہ غالب کے خطوط کا جو اثر سر سید کی نثر پر پڑا ہے اس کو جتنا ہم غور کریں گے اتنا ہی زیادہ واضح پائیں گے۔ تو نثر میں بھی اور نظم میں بھی، دونوں میں ہی ان کا اثر جو ہے وہ ایک زندہ اثر ہے؛ اور برابر اُس میں نئی منزلیں ہم کو مل سکتی ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی



(۳)

میں یہ سمجھتا ہوں کہ غالب کے سلسلہ میں ایک تو یہ غور کرنا ہے کہ وہ اُردو کے بڑے شاعر ہیں؛ یا اردو اور فارسی کو ملا لیا جائے اگر، تو اس میں ان کی کہاں جگہ ہے، دوسرے یہ کہ، پوری دنیا کے ادب میں، جب ہم بڑے شاعروں کی فہرست بناتے ہیں، اس میں ان کا اگر نام آتا ہے تو کیوں آتا ہے؟ پھر تیسری بات، جو بیدار صاحب نے کہی تھی، کہ غالب، بیسویں صدی میں خاص طور پر، یا جب غالب کی اپنی وفات کے بعد سے جو دور اس وقت سے ہمارے ہندوستان میں شروع ہوتا ہے، غالب کیوں اتنا مقبول

رہا ہے اور دوسرے شعرا جو ہیں وہ اتنے مقبول نہیں ہے ہیں
جہاں تک، دنیا کے دوسرے بڑے شاعر ہوئے ہیں،
اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مقبول بھی ہوں۔ یا
آج بھی اُتنے زیادہ SIGNIFICANT ہوں، اُتنے
زیادہ QOUTE کئے جاتے ہوں، یا اُس طرح سے
ان کے مصرعے چسپاں کئے جائیں، اور LINES چسپاں
کی جائیں جیسے غالب۔ تو اس کے معنی کہ غالب ——
ویسے ابھی تک ایسی کوئی کوشش نہیں ہوئی ہے، اگرچہ
عبدالرحمن بجنوری نے ایک کوشش کی تھی، کہ ان کو عالمی
پیمانے پر دیکھ کر کے دنیا کے بڑے شاعروں کی صف میں
لایا جائے۔ لیکن آج اُن کی تنقید کا خاصہ حصہ مجھے تو بہت
ہی بچکانہ، اور بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، اس میں
وہ کامیاب نہیں رہے ہیں۔ ویسے یہ کوشش ہو سکتی ہے کہ
مثلاً ہم غالب کو شیکسپیر یا اور جو دنیا کے بڑے بڑے شاعر ہیں
ان کے مقابل رکھ کے دیکھیں، اور دیکھیں کہ کون سے عناصر
ہیں کہ جن کی وجہ سے ہم غالب کو ان کا ہم پلہ قرار دے
سکتے ہیں۔

لیکن سب سے زیادہ جو ہے وہ غور کرنے کی بات،
جس کی وجہ سے غالب SIGNIFICANT شاعر ہے
ہمارے لئے اُردو کے اور فارسی شعرا کے یا مشرقی شعرا کے
مقابلہ میں، کہ:

غالب سب سے پہلا شاعر ہے کہ جس کے یہاں
زندگی کا متحرک تصور ملتا ہے: کہ زندگی جو ہے وہ ایک دائمی
چیز ہے۔ اس تصور کی وجہ سے اس کے یہاں اقدار کے
بارے میں بھی ایک تیار رویہ ملتا ہے۔

دوسرے یہ کہ، پہلے لوگ زندگی کو ایک سادہ حقیقت
سمجھتے تھے، اور کسی نہ کسی قسم کی عینیت پسندی یا IDEALISM
میں مبتلا تھے؛ اس لئے زندگی کے ایک پہلو کو وہ IDE-
ALISE کرتے تھے۔ مثال کے طور پر، حسن کو یا عشق کو
یا غم کو یا کسی ایک کیفیت کو، اُسی کو پوری زندگی سمجھتے تھے۔
زندگی بہ یک وقت غم کا بھی اور مسرت کا بھی مجموعہ ہے؛
بہ یک وقت ہجر اور وصال کا مجموعہ ہے؛ بہ یک وقت عشق
بھی ہے، اور غیر عشق بھی ہے۔ اس پیچیدگی کو اس سے
پہلے، تو فارسی میں کسی نے محسوس کیا تھا، نہ اردو میں کسی شاعر
نے! یہ PARADOXICAL حقیقت جو ہے زندگی کی،
کہ وہ خیر و شر کا اور غم و نشاط کا مجموعہ ہے، اس کو سب سے
پہلے غالب نے محسوس کیا تھا۔ یہی چیز ہے جو اس کو جدید
ذہن سے —— بعد میں جو ذہن شروع ہوتا ہے، بعد کا
جو پورا ذہن ہے وہ —— زندگی کی اس پیچیدگی کو
اس نے محسوس کر لیا تھا؛ اور زندگی کے متحرک ہونے کو
محسوس کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے ذہن والوں کے
لئے غالب جو ہے وہ ایک SIGNIFICANT شاعر
بن گیا۔ دوسرے شعرا بھی ہمیں اپیل کرتے ہیں، لیکن وہ ایک
محدود لمحہ میں ہمیں اپیل کرتے ہیں۔ مثلاً، مثال کے طور پر،
میر ہیں، درد ہیں، آتش ہیں اور بہت سے شعرا، حافظ ہیں،
سعدی ہیں، بہت سے! لیکن ایک اسٹیج میں ہم کو معلوم
ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو پورے طور پر شاید نہیں
دیکھا تھا؛ کُلی حقیقت تک، زندگی کی پہنچے نہیں تھے۔
زندگی کی جو پیچیدگی ہے، اور کہیں کہیں ایسی پیچیدگی
ہے کہ زندگی کبھی کبھی بڑی مضحکہ خیز —— زندگی کی بعض
حقیقتیں کبھی کبھی بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں اور ان پر
انسان جب ذرا ہٹ کے غور کرتا ہے تو خود اپنی زندگی پر
یا گزرے ہوئے لمحہ پر ہنسی آتی ہے۔ اس پر ہمیں طنز کرنے
کو جی چاہتا ہے۔ خود اپنی حماقتیں انسان کو یاد آتی ہیں اور

پھر اس کو حماقت تسلیم کرنے کے لئے، اس کا اعتراف کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ مثال کے طور پر عشق کو ہی لے لیجئے۔ غالب نے اپنے خط میں خود ایک جگہ لکھا ہے کہ مجھے عاشقانہ شاعری سے وہی نسبت ہے، میرے کلام کو عاشقانہ شاعری سے وہی نسبت ہے، جو کفر کو ایمان سے۔ یعنی، خود غالب نے انکار کیا ہے کہ، میری شاعری عاشقانہ نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عشق کی کیفیت کو محسوس نہیں کرتے؛ میرا یہ خیال ہے، غالب کہنا یہ چاہتے ہیں، کہ ان معنوں میں عاشقانہ نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عشق کی کیفیت کو محسوس نہیں کرتے؛ میرا یہ خیال ہے، غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ان معنوں میں عاشقانہ نہیں ہے، جنھوں نے زندگی کو عشق و محبت سے ہی تعبیر کیا تھا، یا جن کے لئے زندگی اور عشق و محبت لازم و ملزوم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں عشق کے بارے میں بھی ایک حقیقت پسندانہ تصور ملتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان سے پہلے، جتنی بھی اردو فارسی شاعری ہے عشق کو ایک ایسی حقیقت مانا گیا ہے کہ اگر وہی مل جائے ہم کو تو زندگی کا سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ غالب نے اس سے انکار کیا ہے۔ مثلاً یہی ان کا شعر کہ:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اس معنی کے بہت سے اور اشعار ہیں، میں طوالت میں نہیں جانا چاہتا۔

دوسرے یہ کہ حسن کو IDEALISE کیا گیا ہے کہ محبوب سب سے خوبصورت ہے، یا ہمارا محبوب سب سے خوبصورت ہے؛ یا محبوب کا ایک مطلق یا ABSTRACT تصور؛ غالب نے اس تص[illegible] نکالی ہے۔ مثلاً محبوب کے بارے میں جب وہ کہتا ہے:

حسن مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا!

یا:

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

یہ، حسن کے بارے میں یہ حقیقت پسندانہ تصور، غالباً میر یا کوئی اور شاعر نہیں کہہ سکتا تھا!

[سرور: اس میں تو نہیں ہے 'بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا' ایک حسین چیز کے مقابلہ میں دوسری حسین چیز لایا ہے۔ اعظمی: نہیں اس میں بھی ہے]

[ایک آواز: عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے]

یا مثلاً خود یہ ATTITUDE عاشق کے لئے ضروری ہے کہ وہ گویا ہر حال میں محبوب کا وفادار ہو۔ اس کے یہاں ایک طرح کی سپردگی ہونی چاہئے۔ تابعداری ہونی چاہئے ہر طرح کا غم اٹھانا چاہئے، ذلت تک اٹھانی چاہئے اگرچہ غالب کے یہاں بھی کہیں کہیں ایسے مضمون ملتے ہیں جس میں وہ ذلت ——— لیکن غالب انحراف کرتے ہیں۔ مثلاً یہی شعر کہ:

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

یا یہ کہ:

دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

اس مفہوم کے اشعار پہلے نہیں تھے، ہمارے یہاں۔ یہ حریفانہ انداز یا اس طرح کا حقیقت پسندانہ انداز نہیں تھا غالب سے پہلے [وارث کرمانی: بعض لوگ اس کو گریز بھی تو کہہ سکتے ہیں!] یا اسی طرح سے بعض کردار یا

بعض ——— جن کو ہم IDEALISE کرتے تھے۔
مثلاً مجنوں کی محبت ہے۔ مجنوں کی محبت ایک IDEAL محبت سمجھی جاتی تھی جو MEDIEVAL AGES کی محبت تھی جس میں کہ آدمی سب کچھ محبت کے لئے قربان کرتا تھا۔ غالب نے جا بجا مجنوں کا مذاق اڑایا ہے، فرہاد کا مذاق اڑایا ہے:

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

منصور تک کا مذاق اڑایا ہے کہ:

ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

تو اس طرح کے جتنے، تمام، پرانے IDEALS تھے اُس کو غالب نے اسی لئے توڑا کہ غالب نے محسوس کر لیا تھا کہ زندگی میں کوئی چیز IDEAL نہیں ہے، کوئی حقیقت جو ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ اُس کو حقیقتِ کلّی مان لیں، کیوں کہ زندگی تغیر پذیر ہے۔ تو یہ چیز ایسی ہے جو غالب کے یہاں ذہن کا بھی عنصر پیدا کرتی ہے اور جدید بھی بناتی ہے۔ اگرچہ ذہن کا عنصر پہلے بھی ہے۔ مثال کے طور پر، تصوف کی شاعری! وحدت الوجود کی وجہ سے! خود وحدت الوجود کے نظریہ میں یہ عنصر ہے کہ زندگی کو کلّی طور پر دیکھا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں تصوّف کا جو عملی پہلو رہا ہے وہ گویا ایک طرفہ قسم کا رہا ہے۔ خود تصوف کے فلسفہ میں تو یہ عنصر موجود ہے کہ زندگی کو کلّی طور پر، اس کی وحدت کو دیکھا جائے۔ لیکن جو رائج تصوف رہا ہے، جس میں زندگی کو عام طور پر محدود کر دیا ہے، اور صرف سوز و گداز سے یا صرف اس کے ایک پہلو تک، صرف جو اس کا جمالی پہلو ہے ——— جلالی پہلو کو کم دیکھ پائے ہیں۔ جمالی پہلو کو زیادہ ——— حافظ وغیرہ کے یہاں تمام، یہ، ——— اُس کو دیکھا ہے۔ لیکن غالب نے وحدت الوجود کے نظریہ سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ، جو لوگ کہتے ہیں کہ غالب کے یہاں تصوّف نہیں ہے، تصوف برائے بیت ہے، میں اس بات کو نہیں مانتا ہوں۔ غالب کے یہاں خود زندگی کی وحدت کا، جو تصور آیا، اس کا پس منظر تصوف ہی ہے، یعنی وحدت الوجود کا نظریہ! البتہ وحدت الوجود کے نظریہ کو، غالب نے اپنے شعور اور اپنی ذہانت کی وجہ سے ایک نیا CONTEXT دے دیا، اور اس کو ایک نئے دور سے ہم آہنگ کر دیا یہی وجہ ہے کہ اس کے بہت سے اشعار جو شروع تو تصوف سے ہوتے ہیں لیکن وہ بہت SIGNIFICANT ہیں، ——— مثلاً یہ کہ:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟

تو یہاں یہ سوال جو قائم کرتا ہے، یا تشکیک جو آتی ہے، یہ خود نئے دور کے لئے بہت زیادہ معنی خیز بن جاتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان خود گویا چیزوں کو نئے سرے سے دریافت کرنا چاہتا ہے۔ تو یہ دریافت جو ہے، چیزوں کو نئے طور پر پرکھنا، پرانی اقدار کو پھر سے جانچنا، اور پرانے جو مسلمات ہیں ان پر گویا سوالیہ نشان قائم کرنا، یہ ایسے عناصر تھے جس نے غالب کے کلام میں ایک طرح کا وزن اور DEPTH بھی پیدا کی۔

دوسرے یہ ہے کہ اگر فرض کیا غالب صرف یہ ہوتا کہ ان کا فکری پہلو ہی ہوتا، اور اس کو مجرد طریقہ پر کہتے، تو شاید بعد میں اتنا مقبول نہیں ہوتے۔ غالب نے کیا یہ کہ صرف ABSTRACTION میں، صرف تجرید کے عالم

ہیں، نہیں رہے۔ بلکہ اس نے زندگی کی جو چھوٹی چھوٹی حقیقتیں ہیں ان کو بھی سامنے رکھا اور ان سے مربوط کیا۔ غالب کی عظمت کی سب سے —— جیسا کہ سرور صاحب نے کہا THISWORLDLINESS، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت SIGNIFICANT بات ہے کہ اس نے ایک چھوٹی سے چھوٹی بات کو، پیش پا افتادہ اور معمولی مسئلہ کو بھی اس طرح سے دیکھا کہ وہ ایک بڑی حقیقت کا جزو معلوم ہو۔ داغ کے یہاں بھی مثلاً ویسے اچھے اشعار ہیں کہ ہم ان کے اشعار کو یا ذوق کے اشعار کو بھی چسپاں کر دیں زندگی کے بہت سے مسائل، روزمرہ کے معاملات ہیں؛ وہ اشعار بھی QUOTE کئے جاتے ہیں۔ جرأت کے شعر QUOTE کئے جاتے ہیں؛ اور بہت سے لوگوں کے۔ لیکن وہ اشعار جو ہیں وہ اتنے زیادہ SIGNIFICANT نہیں بن پائے —— پوری زندگی کے CONTEXT میں بہت زیادہ معنی نہیں رکھتے ہیں؛ ایک خاص لمحہ میں یاد آتے ہیں۔ غالب کے اشعار پر جب ہم غور کرتے ہیں تو بہت ایسے اشعار جو بظاہر بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں: کہیں طنز و مزاح کا پہلو اختیار کیا ہے؛ وہاں بھی مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شخص جو ہے اس کی پوری زندگی پر نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں تنوع بہت زیادہ ہے۔ یعنی، سب سے بڑی خوبی غالب کے یہاں یہ بھی ہے میر اور دوسرے شعرا کے مقابلہ میں، کہ وہ لوگ ایک ہی کیفیت میں ساری عمر گرفتار رہے، یا زندگی کو ایک ہی زاویہ سے دیکھتے رہے خود اپنے رویہ پر کبھی بھی انھوں نے نظر ثانی نہیں کی۔ غالب خود بدل دیتا ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں غالب کے یہاں متضاد اشعار ہیں:

ایک جگہ 'دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے' کہتا ہے؛ اور ایک جگہ یہ بھی کہتا ہے کہ

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

میں اس کو تضاد نہیں کہتا ہوں؛ زندگی میں خود تضاد ہے۔ زندگی خود ایسی متضاد حقیقت ہے۔ دونوں حقیقت ہیں؛ وہ بھی ایک لمحہ ہے اور دوسرا بھی ایک لمحہ!

[وحید اختر: یہ شعر عشقیہ خالص تو نہیں ہے
اعظمی: پوری غزل جو ہے 'مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے'، اس کو اگر پوری غزل کا دہ دیں تو وہ —— وحید اختر: اس کو دوسرے CONTEXT میں بھی تو ——]

اعظمی: ہاں وہ تو اور بات ہے۔ ان کے تمام عشقیہ اور غیر عشقیہ اشعار ایسے ہیں کہ وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ آپ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ 'دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے'، اس میں عشق و محبت کی کیفیت نہیں ہے، یا اس شعر سے مربوط نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے یہ مسئلہ آپ نے اٹھایا تھا کہ غالب کے شعر پہلو دار ہوتے ہیں، یا ان کے ایک سے زیادہ معنی —— غالب نے خود کہا ہے؛ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، حالی نے سب سے پہلے زور دیا تھا۔ لیکن حالی نے کیا خود غالب نے ہی کہا ہے۔ غالب نے اپنے خطوط میں بار بار اس بات کو کہا ہے کہ میرے اشعار پہلو دار ہوتے ہیں، تہ دار ہوتے ہیں، انھیں اور بھی طرح طرح سے دیکھا جا سکتا ہے، ان کے معنی نکل سکتے ہیں؛ گویا کوئی ایک متعین معنی نہیں ہیں۔ تو یہ تو اور بھی —— اب جدید تنقید نے تو ثابت کر دیا ہے کہ اچھی شاعری جو ہوتی ہے وہ امکانات کی شاعری

ہوتی ہے، اس میں معنی کے امکانات ہوتے ہیں کہ سو برس کے بعد اس کو نئے CONTEXT میں بھی دیکھا جا سکتا ہے، نئے معنی دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ [سرور: خلیفہ عبدالحکیم نے کیا ہی یہ ہے]

خلیفہ عبدالحکیم نے بھی اس طرح سے شرح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اچھی شاعری کی پہچان ہی یہ بتائی ہے کہ جو متعین معنی نہ رکھتی ہو، بلکہ اس میں معنی کے امکانات ہوں، کہ ہر نسل اپنے طور پر اس میں نئے معنی دریافت کر سکے، تلاش کر سکے۔ اور لوگوں کے اشعار میں یہ بات نہیں۔ غالبؔ کی جو SIGNIFICANCE ہے، مثلاً میرؔ کے شعروں میں یا دردؔ کے یا اور جو اچھے شعر ہیں وہ ایک محدود معنی رکھتے ہیں اور اپنی جگہ پر اچھے معنی ہیں؛ لیکن اس میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اپنی طرف سے بھی معنی ڈال لیں اس میں؛ یا آج منطبق کر سکیں، آج کے کسی مسئلہ سے بہت زیادہ مربوط کر سکیں۔ تو یہ امکانات جو ہیں، اس کی وجہ سے غالبؔ بہت زیادہ SIGNIFICANT بن جاتا ہے۔ ویسے جہاں تک رہا عظمت کا تعلق، میں سمجھتا ہوں اردو تنقید پر ابھی یہ قرض ہے باقی، کہ وہ اس کی عظمت کو متعین کر سکے۔ اور، میں تو لکھ بھی چکا ہوں کئی مرتبہ، مجھے شکایت ہے، کہ غالبؔ پر تحقیق بہت کچھ ہوئی اور بہت سے نئے مسائل سامنے آئے ہیں لیکن اس کا پورے طور پر ہیں نے استعمال نہیں کیا ہے۔ ابھی تک ہماری تنقید جو ہے، وہ شیخ اکرام نے جہاں تک لکھ دیا تھا اس سے، بہت زیادہ آگے نہیں بڑھی، انھیں باتوں کو کم و بیش دہرایا جاتا رہا ہے، الفاظ بدل بدل کے بات کہے جا رہے ہیں۔ یا بہت زیادہ مبہم طرز پر، خلاصے کے طور پر، کہا جاتا رہا ہے، کہ غالبؔ کے کلام میں فکر کا عنصر ہے، غالبؔ کے یہاں ذہن ہے، یا غالبؔ کے یہاں پیچیدگی ہے؛ ان باتوں کو ہم سادہ طریقہ پر کہتے رہے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے ہم اس کا پورا تجزیہ کریں، اور نہ صرف تجزیہ کریں، بلکہ دنیا کے جو اچھے اچھے شاعر ہیں ان کے مقابل میں رکھ کے تجزیہ کریں، تب جا کر کے اردو میں غالبؔ پر صحیح تنقید وجود میں آئے گی۔ یہ عظمت کا معاملہ جو ہے اب بھی، میں سمجھتا ہوں کہ، ایسا ہے کہ اس پر مزید غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تو، ایک تو اس کی عظمت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ کے یہاں تنوع بہت زیادہ ہے؛ تنوع اور ہمہ گیری ملتی ہے۔ اس نے پوری زندگی کو دیکھا تھا، زندگی کے ایک رُخ پر، ایک پہلو پر قناعت نہیں کی تھی۔ اس کے یہاں خود ایک مسلسل ذہنی ارتقا ملتا ہے، وہ زندگی کی کسی ایک کیفیت یا ایک رویہ پر ٹھہر نہیں گیا بلکہ مسلسل متحرک رہا۔ ساری عمر متحرک رہا۔ اپنے رویہ پر نظرِ ثانی کرتا رہا۔ یہ اس کا DYNAMIC ہونا، متحرک، اور مسلسل نئے نئے سوالات قائم کرنا اور نئے جواب ڈھونڈنا، یہ اس کی عظمت کی بہت بڑی ——

دوسرے یہ کہ اس کے اشعار میں یک سُرا پن نہ ہونا، ایک دکا نہ ہونا، بلکہ اس میں اتنی سطحیں ہونا، اتنے معنی خیز ہونا، اتنے معنی کے امکانات ہونا کہ نئے نئے معنی نکالنے کی گنجائش رہے۔

اور، تیسرے یہ اس کے ذہن کا جدید ہونا۔ جدید کے معنی یہ ہیں کہ حقیقت پسندانہ اور متحرک ذہن رکھنا، ایسا ذہن جو زندگی کو کسی ایک آئیڈیل میں بند نہیں کرتا بلکہ پورے طور پر دیکھنا چاہتا ہے، کل حقیقت کو! یہ چند باتیں ہیں جن کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ غالبؔ عظیم شاعر ہیں۔

(۴)

غالب کی بڑائی اور غالب کی شاعری کو سمجھنے کیلئے
ہمیں — جو کبھی ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب یا com
POSITE CULTURE جسے آپ کہتے ہیں اس
دور میں جس نقطہ پر پہنچ چکی تھی، اس کے وہ ایک TYP
ICAL REPRESENTATIVE تھے۔ غالب جیسی اور
بہت سی دوسری شخصیتیں رہی ہوں گی۔ جن کا مزاج وہی تھا،
جن کے مشاغل وہی تھے۔ جن کے عقائد وہی تھے۔ اور جن
کی شعری دلچسپیاں اسی قسم کی تھیں، لیکن جس طرح سے وہ ہمارے
تہذیبی ارتقا کی نمائندگی کرتے ہیں — غالب کی حیثیت
اور ان کے معاصرین کی حیثیت ہماری تہذیب کے دائرے
میں — وہ، وہ نقطہ ہیں جہاں سے نئی تہذیبی قدریں
جنم پاتی ہیں اور ان کو بعد کی آنے والی نسلیں INHERIT
کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی باتیں ہماری سمجھ میں آجاتی
ہیں غالب سے پہلے کے شعراء میں دو چار شعراء کو چھوڑ کر ہم
— اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمہ گیری اور قبول عامہ کو اگر دیکھا
جائے تو اس کی شاعری بہت بڑی شاعری ہے۔ غالب کی
یہ خوش نصیبی ہے کہ اس کی شاعری کو قبول عامہ نصیب ہوئی
آل احمد سرور: بھئی مجھے اس میں شبہ ہے۔ قبول عامہ
نصیب ہو ہی نہیں سکتی تھی اپنے زمانے میں۔ آج جو قبول عام
ہے وہ — تو قبول عامہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے

کہ وہ بڑا شاعر ہے لیکن ـــ

نعمان احمد صدیقی: غالب کی بڑائی کے عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے: ایک تو یہی کہ ان کے یہاں HUMANISM ہے۔ اس دنیا سے ان کو محبت ہے جو اتنی بے محبت ہے جس سے محبت ہے، اور GLAD COFIRMATION OF LIFE ـــ جو نتیجہ تھا نشاۃ ثانیہ کے دور کا، خاصا واضح ہے رویہ۔ مگر اس زمانے میں بھی یہ سمجھنا غلطی ہے کہ یہ لوگ جو نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے ـــ لیکن انہوں نے ان دونوں نظریات کو کسی طرح ملا دیا جو مجھے غالب کی شاعری میں ان کو بڑا اپناتی نظر آتی ہے

وہ ـــــ

دوسری چیز ان کی خلاقانہ صلاحیت ہے، فن کا خلاقانہ استعمال، کہ کس طرح ایک معمولی خیال بھی ایک شہپارہ بن سکتا ہے ــــ ہر چیز، عقیدے، نظریے پر از سر نو غور کرنا، یہ جرأت، ہمیں غالب کے یہاں ملتی ہے۔ جو عام انسان کو ان کو قریب لاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ غالب کے وہ اشعار زیادہ POPULAR ہیں، اور زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ جس میں ایک قسم کی معاملہ بندی ہے: کہ ان کے اور محبوب کے درمیان کس قسم کے تعلقات تھے، اس میں ان کو کیا سانحے پیش آئے۔ ان کا جس صفائی اور بے باکی سے وہ اظہار کرتے ہیں غالب سے پہلے ـــ لیکن ساتھ ہی ساتھ خلاقانہ صلاحیت ایسی ہے جو ان کے اشعار کو لچر نہیں بننے دیتی۔

چوتھی چیز: میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سعی لاحاصل ہوگی کہ غالب کے یہاں کوئی فکری میلان سمجھا جائے۔ یہ کوشش بجنوری نے کی، یہ کوشش سردار جعفری نے کی جس میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے فلسفہ کے قائل تھے۔ لیکن شعوری طور سے یا غیر شعوری طور سے اس میں انہوں نے اضافہ بھی کیا ہے، اور اس کو ایک حرکی تصور دیا ہے۔ وہی جو ابھی DYNAMISM کی بات ہو رہی تھی کہ زندگی مسلسل بدلتی ہے اور بدلتی رہے گی۔ اور حقیقت کے مطابق نت نئے رنگ میں سامنے آتی رہے گی یعنی ارتقاء کا تصور۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑا اقدام ہے۔ اگر حرکی تصور ان کے یہاں تھا اس زمانہ کے جو علوم متداول تھے، اُن سے غالب واقف تھے، اور آپ اس زمانہ کا فلسفہ یا ادب ـــ بات وہی ہے کہ اپنے اپنے ڈھنگ سے جو شخص غالب کو پڑھے گا اُسے اُس کے مطلب کا شعر مل جائے گا۔ اس سے ایک مربوط فلسفہ کی بنیاد قائم کی جائے، یہ غالباً ضروری نہیں کہ غالب کی شاعری کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے یہ کیا جائے۔

وحدت الوجود کا اثر ان پر ہے، بعض اشعار میں،

لیکن ـــ

آل احمد سرور: اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں کہ غالب نے جو کہا ہے

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

کیا آپ اس کو عشقیہ شاعری کہیں یا اس میں اور کچھ بھی ہے۔

نعمان احمد صدیقی: نہیں، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ایک طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو اقبال پر اعتراض کرتے ہیں کہ فکری نظام نہیں ہے اور جاہل آدمی تھے ـــــ تو یہاں مربوط فکر کا مسئلہ ذرا ذمہ داری کا کام ہے ـــــ

ہمیں اب اردو تنقید جس دور میں آ چکی ہے، اب ہم زیادہ مبالغہ آرائی سے کام نہ لیں تو میرے نزدیک ہیومنزم، خلاقانہ فن کاری کی صلاحیت اور تیسرے ان کا انسانی رویہ، یہ غالب کی بنیادیں ہیں۔



۵

جہاں تک غالبؔ کی عظمت کا سوال ہے ہم اردو والے تو غالبؔ کو اپنا سب سے عظیم شاعر مانتے ہیں، اور دنیا کے عظیم شاعروں میں غالبؔ کا شمار بھی کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ خلیل صاحب نے ابھی کہا، غالبؔ پر بہ ظاہر بہت کام ہوا ہے۔ کتابیں لکھی گئیں بہت ساری، سیکڑوں مضمون لکھے گئے۔ لیکن اس کے باوجود جہاں تک غالبؔ کی اصل عظمت کو متعین کرنے کا، اور اُسے سمجھنے کا سوال ہے، اب تک جتنا بھی کام ہوا ہے بہت ہی کم ہے، برائے نام ہے۔ غالبؔ کو عظیم

بنانے کی جو سب سے پہلی کوشش، یا غالب کی عظمت پر روشنی ڈالنے کی کوشش، عبدالرحمٰن بجنوری نے جس طرح سے کی، اس میں انھوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ غالب کو بلاوجہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں سے موازنہ کر کے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے یہ بھی کیا کہ جہاں تک ڈرامائیت کا سوال ہے، انسانی نفسیات کو سمجھنے کا سوال ہے، غالب بڑے ہیں۔ اور اگر انھوں نے کسی شاعر کو غالب کے برابر مانا ہے تو وہ مانا ہے انھوں نے گیٹے کو۔

اور جہاں انھوں نے غالب کی بیانیہ شاعری کا ذکر کیا ہے، اور وہ اشعار بھی انھوں نے غزل ہی سے لیے ہیں، وہاں انھوں نے یہ تک لکھ دیا ہے کہ غالب ہومر اور ورجل سے بھی بڑے شاعر ہیں، ہومر اور ورجل اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ تو غالب کو اس طرح سے عظیم ثابت کرنا غالب کے ساتھ بھی زیادتی ہے اور دنیا کے ان بڑے شاعروں کے ساتھ بھی، جن کا میدان غالب سے مختلف تھا۔

اصل میں غالب کی عظمت کو سمجھنے کے لیے ہمیں دو طرح سے مسئلہ کو دیکھنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ غالب کی اپنے عہد میں، اور اس کے CONTEXT میں، عظمت کا راز کیا ہے؛ اور دوسرے یہ کہ بعد کے دور میں ان کی عظمت کا احساس روز بروز کیوں قوی تر ہوتا گیا؟ جہاں تک غالب کے عہد کا سوال ہے غالب سے پہلے بھی بڑے شاعر گزرے ہیں، اور آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو میر کو خدائے سخن مانتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ میر کے یہاں بھی فکری اشعار کا انتخاب کیا جائے، ایسے اشعار جو فکر کی بہت اونچی سطح پر ہوں اور جن میں جذبہ کی آمیزش بھی ہو، اور بہت اچھا انتخاب میر کا کیا جائے، تو شاید میر کا پلّا بہت زیادہ ہلکا غالب کے مقابلہ میں نہیں ٹھہرے گا۔ (آل احمد سرور: ایسا آپ سمجھتے ہیں؟)

اس کے لئے بہت زیادہ سخت انتخاب کی ضرورت ہو گی پورے کلیات کا مطالعہ کرنے کی۔ میں غالب کے ذہن کو اس کے باوجود میر کے ذہن سے آگے سمجھتا ہوں، اور غالب کے دور کے دوسرے جو شاعر تھے یا میر کے بعد اور جو شاعر گزرے ہیں غالب تک، ان کے یہاں ہم کو ذہن آگے جاتا ہوا نظر نہیں آتا، بلکہ روایت کا اسیر اور روایت کا پابند نظر آتا ہے۔ غالب کے عہد میں بہت اچھے شاعر گزرے ہیں، اپنے اپنے طرز پر ذوق بھی ہیں، مومن بھی ہیں، اور اُدھر لکھنؤ میں آتش بھی ہیں، اور مرثیے کے میدان میں انیس بھی ہیں لیکن یہ کہ غالب میں اور ان سب میں بہت بڑا فرق یہ ہے کہ یہ لوگ روایت کے پابند رہے ہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے اسیر بھی رہے ہیں۔ غالب اپنے زمانے سے ایک حد تک، ایک معنی میں، ماورا نہیں تھے۔ غالب اپنے زمانے کے آدمی تھے۔ ان کی عظمت، ان کی فکر، ان کی شاعری، ان کا فن، ان کی شخصیت سب کچھ اپنے ہی زمانے کی پیداوار تھی۔ اس کے باوجود غالب اپنے زمانے سے آگے نکل گئے؛ اور انھوں نے بہت ساری روایتوں کو توڑا یا روایتوں کی توسیع کی؛ اور بہت سے نئے امکانات کی طرف انھوں نے ہماری رہنمائی کی۔ غالب نے جس طرح سے اپنے عہد کو سمجھا، اس طرح سے ذوق نہیں سمجھ پائے، مومن بھی نہیں سمجھ پائے اور وہ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اِس لئے کہ ان لوگوں کی نگاہ محدود تھی؛ اور شخصیت بھی غالب کے مقابلہ میں بہت معمولی تھی۔ غالب کے یہاں ہم کو جس طرح سے پرانی روایات، اور نئی روایات جو اس وقت بن رہی تھیں، یا نئی ہوائیں جو اس وقت مغرب کی طرف سے آ رہی تھیں ان کی کشمکش کا جتنا شدید احساس ہوتا ہے، ہم کو اس کا احساس کا ذرا بھی پرتو غالب کے دوسرے معاصر شعرا کے یہاں نہیں ملتا۔

بلکہ، غالب سے عمر میں چھوٹے تھے، اور وہ بھی ہمارے اردو کی، ہندوستان کی، بڑی شخصیتوں میں ہیں: سرسید۔ اگر سرسید کا غالب کا موازنہ کیا جائے، اور آئینِ اکبری پر جو تقریظ غالب نے لکھی ہے اُسے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالانکہ غالب نے کوئی تحریک نہیں چلائی کوئی بڑا اصلاحی یا مقصدی کارنامہ نہیں انجام

دیا، لیکن اس کے باوجود غالب کا ذہن ہم کو سرسید کے ذہن سے بھی بہت آگے نظر آتا ہے۔ اور وہ امکانات جن پر سرسید کی نظر نہیں تھی، وہ بھی غالب کی نظر میں تھے۔ سرسید نے مغربی تعلیم پر اور سائنس سے واقفیت پر ضرور زور دیا، لیکن اس کے پورے امکانات کو، یہ جو نئی تہذیب آرہی تھی، نئی قدریں آرہی تھیں نئے علوم کے ساتھ، ان کو سرسید اس طرح سے پوری طرح سمجھ نہیں پائے جس طرح سے غالب۔ اور غالب نے سرسید سے پہلے ہی، سرسید کو جب اس کا پوری طرح سے احساس بھی نہیں تھا جب وہ آئین اکبری کا کام کر رہے تھے، اس وقت متوجہ کیا کہ مغرب میں جو ترقی ہوئی ہے اس کو ہمیں دیکھنا چاہیے اور ان پرانے قوانین کو مرتب کرنے میں اور ان کو پڑھنے میں ——————

تو اس طرح سے غالب اپنے معاصرین سے ذہنی لحاظ سے آگے تھے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں ہم کو سب سے زیادہ روح عصر بھی ملتی ہے۔ مومن یا ذوق کے کلام سے ہم کو ان کے عہد کی جو تمام پیچیدگیاں تھیں، جو مسائل تھے، جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کا اندازہ بہت کم ہو پاتا ہے۔ لیکن غالب کی شاعری سے بھی ہم کو اس زمانے کے ایک ایسے شخص کا جس کا ذہن سوچ سکتا تھا، جو محسوس کر سکتا تھا، تمام پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا اس کا پوری طرح سے اندازہ ہوتا ہے۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ عظمت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صرف مقامی نہ ہو، زمانی نہ ہو، بلکہ اس میں آفاقیت اور ابدیت کے بھی امکانات ہوں چنانچہ غالب اپنے زمانے کی آواز ہوتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے بھی اگلے زمانوں کو سمجھ رہے تھے، یا اس کا بڑی حد تک وہ اندازہ کر رہے تھے۔ اسی لیے غالب کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں نے ان کے اشعار سے وہ معنی نکالنے شروع کیے جو بعد کے دور کے نظریات سے، مابعد کے دور کے حالات سے، اور جو انسان کو آگے چل کر زیادہ پیچیدہ تجربات ہوئے، ان کی پرچھائیاں غالب کے ان اشعار میں ملتی ہیں۔ اور یہ غالب کی بڑائی کا میرے نزدیک سب سے بڑا سبب ہے کہ اپنے زمانے سے ان کی نگاہ اتنی آگے تھی کہ وہ بہت آگے بھی دیکھ سکتے تھے، کہ انسانی سماج میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، انسانی شخصیت میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں اس کا انھوں نے بہت ہی خوبی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ غالب کبھی بھی کسی بھی دور میں پرانے نہیں ہو سکتے۔ اور یہ جو آپ نے شروع میں کہا تھا کہ غالب کی تشریح و تفسیر مختلف لوگ مختلف طرح سے کرتے ہیں، غالب کی مختلف تفسیریں ہوتی رہی ہیں، اور آج بھی ان کے ہر شعر کو نئے معنی پہنائے جا سکتے ہیں، اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ غالب کے یہاں ہم کو ایک طرح کی آزادی ملتی ہے، بت شکنی کے ساتھ ساتھ آزادی کا رویہ جسے NON - CONFORMITY کہا جا سکتا ہے

اور اگر اس سلسلے میں، ہم غالب اور اقبال کا موازنہ کریں تو ہمیں یہ احساس ہوگا کہ غالب کے بعد پیدا ہونے اور شاعری کرنے کے باوجود آج کے دور کے لیے غالب جتنے ضروری ہیں، یا آج کے دور کا آج کے ذہن کا آج کے احساس کا جتنا حصہ ہیں، اقبال اتنے تھوڑے سے برسوں کے گزرنے کے باوجود آج کے ذہن کا اتنا لاینفک حصہ نہیں رہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال نے اپنے آپ کو چند خاص نظریات سے یا چند خاص فلسفوں سے، پوری طرح سے منسلک کر دیا تھا۔ اور غالب کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ ان کے متجسس اور متشکک ذہن نے کبھی پوری طرح سے اپنے آپ کو معشوق کیا، کسی نظریہ کے بھی سپرد نہیں کیا، کسی عقیدے کے بھی سپرد نہیں کیا۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جاوید نامہ میں جب اقبال غالب کی روح سے ملاقات کرتے ہیں اور وہاں وہ غالب کے اشعار کے معنی غالب سے پوچھتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس کا جواب بھی انھوں نے غالب کی زبان ہی میں دیا ہے، وہ اقبال کے اپنے اشعار اور اقبال کے خیالات ہیں۔ مجھے ان اشعار کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ غالب خود اپنے شعر میں جتنی معنویت اور جتنی وسعت بھی اقبال نے جس طرح

سے اس کی تشریح اپنے اشعار میں کی ان میں وہ شعر بہت محدود ہوگئے اور ان میں اتنی وسعت، اتنی معنویت، اتنی گہرائی نہیں ہی جو خود غالب کے ایک شعر میں تھی، حالانکہ اقبال نے کئی کئی اشعار میں اس کی تشریح کی ہے۔ بعض مسائل کے سلسلہ میں مثلاً معراج ہی کے سلسلہ میں انھوں نے جس طرح سے سوال کیا ہے اور غالب کے ایک شعر کو اپنے مذہبی نقطۂ نظر سے یا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی ہے، اس کے مقابلے میں مجھے غالب کا شعر زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر معلوم ہوتا ہے۔

تو میرے نزدیک غالب کی عظمت کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ غالب نے خود جو کہا تھا:

میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

تو غالب کی نظر نہ صرف آفریدہ پر تھی جو ان کی زمانے میں پیدا ہو چکا تھا، بلکہ 'ناآفریدہ' پر بھی تھی۔ اور اسی لیے آج کے زمانے تک اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ غالب اس دور کے لیے کتنے SIGNIFICANT ہیں، اس کو معلوم کیا جائے۔ اور اسی میں غالب کی عظمت کا راز تلاش کیا جاسکتا ہے۔

[آل احمد سرور: بھئی، وحید اختر صاحب! یہ جو آپ نے کہا ہے کہ غالب نے سرسید کے آئین[1] کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کا ذہن تو پرانا تھا اور غالب کا نیا تھا: میرے خیال میں بات یہ نہیں ہے۔ اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ غالب اتنا شعور رکھتے تھے کہ جو مغرب کے اثرات تھے ان کی برکتوں کو سمجھ سکیں۔ لیکن سرسید کا جو کام تھا وہ ایک ریسرچ کا نمونہ تھا۔ اور ریسرچ کا تصور میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ جس معیار کا ہے وہ مغرب نے دیا ہے۔ تو سرسید اپنے طور پر ایک کام کر رہے تھے؛ مگر غالب کا چونکہ خیال مجموعی طور پر یہ تھا، وہ محسوس کر رہے تھے کہ بہت سی پرانی چیزیں جو ہیں وہ از کار رفتہ ہو گئی ہیں، اس لیے ہم کو اب ان کی بجائے مغربی اثرات کو چاہیے، تو اس بات کو وہیں تک رہنا چاہیئے! میرے خیال میں اس سے یہ نہیں نتیجہ نکالنا چاہیے کہ غالب کا ذہن نیا تھا اور سرسید کا پرانا!]

میں نے یہ نہیں کہا کہ سرسید کا ذہن پرانا تھا۔ ظاہر ہے کہ آئین اکبری کو ایڈٹ کرنا بالکل ایک دوسرے قسم کا کام ہے، اور سرسید جس طرح سے سوچتے تھے؛ اور انھوں نے جس طرح سے ہندستانی ذہن کو جدید بنانے کی کوشش کی، اپنے دور تک، وہ بالکل الگ چیز ہے۔ لیکن یہ کہ جس طرح سے غالب نے اس تقریظ میں ایسی چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے، نئے علوم کے امکانات کی طرف اور ان کے اثرات کی طرف، میرا اندازہ یہ ہے کہ خود سرسید کے ذہن میں وہ امکانات اتنے واضح اور اتنے روشن نہیں تھے، اور نہ سرسید کی فکر اتنی دُور رس تھی۔ سرسید کے سامنے ایک اصلاحی مقصد تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو انگریز اور دوسری مغربی قوموں کے مقابلے میں کھڑا کر دیں۔ لیکن اِن علوم اور نظریات کا جو مغرب سے آ رہے تھے جو نتیجہ نکلنے والا تھا، ان پر مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ غالب کی نظر زیادہ گہرائی کے ساتھ پڑ رہی تھی۔

سرسید خود اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت جدید تھے۔ ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے کہ سرسید نے جس زمانے میں آئین اکبری کی ایڈیٹنگ کا کام کیا ہے اس وقت ایڈیٹنگ اور اس کے معیار کا جہاں تک تعلق ہے اس کی بحث نہیں ہے لیکن یہ کہ غالب یہ بھی محسوس کر سکتے تھے کہ مسلمان جو اس وقت غدر کے فوراً بعد غدر سے پہلے، جو مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا، تو مسلمان اپنی عظمت کا صرف نوحہ پڑھ رہے تھے اور اپنی عظمت ہی کے تصور میں مگن تھے کہ ہم نے اپنے زمانے میں اتنا بڑا کام کیا ہے۔ تو غالب کے ذہن میں ایک یہ بھی خیال ہو سکتا ہے کہ اس وقت ہم کو اپنی عظمتِ رفتہ کے قصے سنانے کی ضرورت نہیں، بلکہ آگے جانے کے لیے ہم کو جو کچھ کرنا ہے اس پر زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔

[1] آئین اکبری سرسید ایڈیشن پر غالب کی تقریظ

[آلِ احمد سرور: یہ تو بات ہے. مطلب یہ ہے کہ ان کا ایک علمی کارنامہ تھا: جہاں وہ شاعرانہ طور پر یہ محسوس کرتے تھے کہ ـــ اپنے شاعرانہ اندازِ بیان کی وجہ سے انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ ریسرچ کا جو سلسلہ ہے اس کو اتنی اہمیت نہیں دے سکتے یہ پرانی داستانوں کو کیوں چھیڑ رکھا ہے: 'پُرانی داستانوں کو نہ چھیڑ' یہ غالب نے CARSIFICATION کیا تھا کہنا یہ ہے]

نہیں، مگر یہ خطرہ تو رہتا ہے. یہ ہوا کہ جس طرح بعد میں شرر نے، اور لوگوں نے، شبلی نے ـ کہ انھوں نے عظمت کا تصور اِس طرح سے پیش کیا کہ ماضی پسندی احیاء پرستی کا رجحان مضبوط ہوتا گیا۔

[آلِ احمد سرور: اچھا، ایک دوسری بات آپ نے بہت دلچسپ کہی ہے. اس کے متعلق میں چاہتا ہوں آپ کی رائے معلوم ہو میرے خیال میں غالب کے متعلق یہ کہنا شاید اتنا صحیح نہ ہو کہ آنے والے زمانے کی ان کے ذہن میں آتی تصویریں تھیں. بات ہم اس طرح سے کہیں تو شاید بہتر ہو کہ اصل میں شعور یا نظر ہر ایک کی مختلف ہوتی ہے. بعض لوگ صرف ان حقیقتوں میں گرفتار رہتے ہیں جو سامنے ہیں. بعضوں کی نظر زیادہ گہری ہوتی ہے مثلاً یہ کہ دیوار سامنے ہے بعض لوگ دیوار کے روزن نہیں دیکھتے، بعض دیکھ لیتے ہیں. تو، غالب اس تہذیب کی دیوار کے روزن دیکھ سکتے تھے، یہ ان کی بصارت اور بصیرت دونوں کا ثبوت ہے. PROPHETIC پہلو جو ہے میرا خیال یہ ہے کہ POETRY کو اب PROPHECY سے الگ کرنا چاہیے. بلکہ چونکہ زیادہ گہری نظر تھی اس لیے اس دور کی خوبیاں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جو خامیاں نمودار ہو رہی تھیں وہ بھی تھیں. اور ظاہر ہے کہ آگے چل کر یہ ہوا کہ معنویت جو اپنے دور کی تھی وہ اتنی مقبول نہیں تھی جس چیز میں معنویت زیادہ ہو گی وہ مقبول نہیں ہو گی. ایک دور کی معنویت دوسرے دور کی مقبولیت بنتی ہے. غالب کی جو معنویت اپنے دور میں مقبول نہیں ہو سکی آج وہ مقبول ہو رہی ہے، اور ہو سکتا ہے اور بھی پہلو تلاش کیے جائیں. اور عظمت کی دلیل پھر یہ بنے گی کہ کس کی معنویت کتنی زیادہ مختلف دوروں میں نمایاں ہوتی رہتی ہے]

یہ جو بات آپ نے کہی کہ شاعری کو پیغمبری سے الگ کرنا چاہیے. تو ایک معنی میں تو پیغمبری سے الگ کر سکتے ہیں یعنی پیغام پہنچانے کا کام اور اصلاح کا کام. لیکن اگر پیغمبری کے لیے بصیرت کی بھی ضرورت ہے، بہت دور تک دیکھنے کی، تو شاعری اُن معنوں میں پیغمبری ـــ یعنی بڑے شاعر کا وژن PROPHETIC ہوتا ہے.

[آلِ احمد سرور: اصل میں یہ 'شاعری جزویست از پیغمبری' والی بات ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اب یوں کہنا چاہیے کہ 'پیغمبری جزویست از شاعری']

نہیں، شاعری کو اصلاح کا کام نہیں سپرد کرنا چاہیے.

[آلِ احمد سرور: ایک زمانہ میں PROPHECY رہی، اب اس سے آگے نکل گئی ہے.]

[خلیل الرحمٰن اعظمی: غالب کے اشعار کے بعد میں جو معنی دریافت کیے گئے اگر ان اشعار میں بذاتِ خود یہ POTENTIALITIES نہ ہوتیں تو کیوں دریافت کیے جاتے. جب وہ اشعار شکل بھی تھے اس زبان میں بھی نہیں تھے جو رائج الوقت، سادہ زبان تھی. مثال کے طور پر بعد میں، ایک محدود دور میں بھی داغ مقبول ہوئے. داغ کی زبان بڑی روزمرہ، صاف ستھری، بڑی سادہ زبان ہے. لیکن اگر اس میں وہ حقیقتیں نہ ہوتیں جن کا کہ بعد میں ادراک عام ہو گیا تو شاید ان اشعار میں ہم معنی نہ ڈھونڈ پاتے. اس کے معنی یہ ہیں کہ ان حقیقتوں کو غالب نے اپنے وجدان کی وجہ سے اُسی وقت محسوس کر لیا تھا جب عام ذہن نہیں محسوس کر پاتا تھا. بعد میں یہ حقیقت عام ہو گئی اس وجہ سے ان اشعار میں معنی بھی ہم کو نظر آنے لگے. اس کے معنی یہ ہیں کہ ان اشعار میں POTENTIALITIES پہلے سے موجود تھیں. اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم وہ معنی اس میں دریافت کر ہی نہیں سکتے تھے]

(۶)

.... غالب کے سلسلے میں بجنوری نے جو یہ لکھا ہے کہ ہندستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوان غالب؛ تو اصل میں الہام کا جہاں تک تعلق ہے یہ ایک ایسی چیز ہے کہ بجنوری اسے صحیح معنوں میں سمجھ نہیں سکے تھے۔ الہام وسعت نظر اور ذہنی ارتقا —— آدمی کی نظر جب وسیع ہو جاتی ہے تو بہت آگے کی، دور کی، گرد و نواح کی، اِدھر اُدھر کی چیزوں کو دیکھنے کی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو صحیح نتائج اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی چیز کو بعض لوگوں نے الہام کہنا شروع

کر دیا۔ بجنوری نے عظمت کا بیان کیا لیکن وہ صحیح معنوں میں عظمت کا بیان نہیں ہو سکا۔

حالی نے: غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت ....
آسماں سے زمیں کو کیا نسبت، یہ کہہ کر، صحیح معنوں میں تنقید کی تھی وہ علمی اور عقلی ——

اس کے بعد، مثلاً اقبال ہیں:

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

تو اس کے اندر بھی غالب کے پورے کلام کا تجزیہ ہے اور گوئٹے کے پورے کلام کا تجزیہ ہے اور مقابلہ کیا گیا ہے کہ غالب کے اسلوبِ بیان کے اندر کیا صلاحیت ہے اور وہ کہاں کہاں پہنچا ہے۔ فراست اس کی کن کن منزلوں میں پہنچی ہے۔ ان چیزوں کے اوپر بحث سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ بجنوری صاحب کی الہامیات تو وہی پرانے ڈھنگ کی الہامیات ہیں وہ صحیح معنوں میں الہام ہے ہی نہیں۔ تو، غالب کی عظمت جو ہے وہ صحیح معنوں میں اس کی خودگری کے اندر ہے۔ اگر اس کے اندر خودگری کا جوہر نہ ہوتا تو وہ اتنا بڑا آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس اعتبار سے میں اُسے اقبال اور ٹیگور سے بھی بڑا سمجھتا ہوں! اس لحاظ سے کہ اقبال اور ٹیگور کی شخصیت کو ان کے ماں باپ نے جس طریقے سے نکھارا اور سنوارا، اور ان کے اُستادوں نے جس طریقے سے نکھارا اور سنوارا، اس طریقے سے غالب بے چارے کو تو کچھ بھی نصیب نہیں ہوا۔ تیرہ۱۳ سال کی عمر تک تو ذہنی اعتبار سے وہ برباد ہو گیا۔ تیرہ۱۳ سال کے بعد جب چودھویں۱۴ سال میں وہ دہلی پہنچا ہے، تب اس کو وہ چیز نصیب ہوئی کہ ایک ایسا دوست ملا، فضلِ حق خیرآبادی جیسا، کہ جو واقعی صحیح معنوں میں اس کی شخصیت کو سمجھ سکا، اور اس کی شخصیت کے حسن کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینے کی کوشش کی۔ اگر خیرآبادی کے مشورے شامل نہ ہوتے تو شاید غالب کی شخصیت کو اتنا نکھرنے کا موقع نہ ملتا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ غالب نے —— ظہوری کا ایک تصور ہے:

دریں سادگی نقش را دادہ رنگ
معانی فراخ است و الفاظ تنگ

تو، غالب نے ظہوری کو ایک اُستاد کی حیثیت سے سمجھا اور اس سے بہت کچھ سیکھا۔ تو اس اعتبار سے غالب حالاں کہ بہت خوددار ہے لیکن ظہوری کے لئے یہ کہتا ہے کہ میں اس کے دسترخوان کا جھوٹا بھی کھانے کے لئے تیار ہوں۔

خودگری سے اس کے اندر یہ چیز پیدا ہوئی کہ اپنی کمیوں کا دیکھنا سیکھا، دوسروں کی کمیوں کا دیکھنا سیکھا، اور اپنے ماحول کے فن کاروں کی کمیوں کو دیکھا، ان کی خوبیوں کو دیکھا۔ ایک مقام وہ ہے کہ وہ ذوق کو بُرا کہتا ہے اور بہت ہی پست فن کار سمجھتا ہے، لیکن ایک مقام .... وہ ہے کہ جہاں وہ ذوق کو بھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک بہت اچھا شاعر تھا: "ذوق کہاں، مومن کہاں، اب دہلی ختم ہو گئی، دہلی کہاں، دہلی تو برباد ہو گئی"۔

جو آدمی خودشناس ہو، خودگر ہو تو ذہنی ارتقا ایک لازمی سی چیز ہے۔ اس سے اس کا ذہنی ارتقا جو ہوا اس ارتقا نے اُسے زیادہ سے زیادہ عظیم بنا دیا۔ ابھی میں اس کی عظمت کا راز چھپا ہوا ہے کہ:

اس نے خود کو سمجھا، اچھے فن کاروں کو سمجھا، مشرق کی صحت مند روایات کو سمجھا، اور ان کو سمجھنے کے بعد اپنے کو عظیم بنانے کی خواہش اس کے اندر ابھری جس نے صحیح معنوں میں اس کی نشوونما کی!

وارث کرمانی

(۷)

.... غالب کی شاعری کے سلسلے میں پہلے اس کے دو حصے کر لیں تو بہتر ہوگا ایک تو اس کی CRFTSMANSHIP شاعری، اور دوسرے پھر اس کا جو THOUGHT CONTENT ہے۔ حالاں کہ تجزیہ کرنے سے شاید عظمت کچھ DIM ہوجاتی ہے، مدھم ہوجاتی ہے۔ جہاں تک کہ شاعری کا THOUGHTCONTENT ہے اس میں ہم کو ایک چیز یہ محسوس ہوتی ہے کہ پہلے کے شاعروں کے مقابلہ پر غالب کے ہاں تعقل INTELECTUALELEMENT' زیادہ DOMINATE کرتا ہے۔ اسی تعقل میں شاعروں کی نفسیاتی واقفیت، روایت سے بغاوت عقائد میں تشکیک، اور طنز و ظرافت وغیرہ بھی آجاتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان کی الگ الگ نشان دہی سے وہ

تصویر نہیں بنتی جس میں کہ غالب کی صحیح عظمت ہم دیکھ سکیں۔

جہاں تک کہ ان کی صناعی کا تعلق ہے، اور فن کاری اس میں بھی غالب مغل اسکول کے پروردہ ہیں۔ ان کی بندشیں، اصطلاحیں، استعارے، اور کنائے زیادہ تر بے دل، نظیری، اور ظہوری کے ہاں سے مستعار ہیں لیکن اردو زبان میں غالب کا CONTRIBUTION یہ ہے کہ انھوں نے ان تلمیحوں کا اور استعاروں کا کچھ ایسے انوکھے انداز TRASPLANTATION سے کیا ہے اور بعض IMAGERIES اور استعاروں کو انھوں نے ایک نئی SETTING میں لاکر ایک خاص معنی دیئے، جیسے آتش کا استعارہ۔ اس سے ان کے عجمی تعلق، اور عجم سے ان کو جو عقیدت تھی، اس سے یہ خاصا RELATED ہے، اور شاعر کے فکرو احساس کے متعدد پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے، کہیں اس سے تخلیقی عمل کو ظاہر کیا گیا ہے:

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیر من بری

[ایک آواز: پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی ———]

کہیں یہ استعارہ شاعر کے سوزدروں کی علامت بن گیا ہے، جیسے یہ شعر:

نہ بدر جستہ شرارہ بجا ماندہ رماد
سوختم، لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

کسی جگہ یہ استعارہ پیشرو شاعروں کے ساتھ غالب کے ذہنی سلسلہ کو ظاہر کرتا ہے جیسے،

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختہ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

کسی جگہ یہ محبوب کے حسن کا علامتی نشان معلوم ہوتا ہے:

مہ کہ ہندو در رہش گوید ہمی
قبلۂ آتش پرستاں می رود

غالب کی شاعری کا فکری و فنی تجزیہ کرنے سے بے شمار پہلو سامنے آتے ہیں، لیکن جس عظمت کی دریافت آج کی گفتگو کا موضوع ہے وہ اس تجزیہ سے منتشر ہوجاتی ہے۔ اس عظمت کو تھوڑا تاثراتی ہوکر ہی ہم سمجھ سکتے ہیں۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے۔ تاثراتی سے یہ مطلب ہے کہ غالب کے تمام شعری کارنامہ کی ایک 'TOTAL PICTURE' اس کو TOTALITY کے اندر دیکھنا؛ اس کی عظمت تک پہنچنے کے لئے وہ ضروری ہے۔ ان کے اشعار ہمارے ذہن پر جو اثرات چھوڑتے ہیں ان سے ایک خاص نظامِ تصور قائم ہوتا ہے، جو اردو ادب میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اور ہند و ایران کے تمدن کے کارناموں میں سب سے زیادہ مقبول بھی ہوا ہے۔

غالب کی شاعری سے جو نظامِ تصور ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے، عام قاری کے ذہن میں، اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اپیکیورس کے فلسفہ کی طرح کھاؤ پیو اور خوش رہو والا فلسفہ نہیں ہے، جیسے حافظ نے خیام نے اور بعض دوسروں نے اپنایا ہے۔

دوسرے یہ کہ غالب کے یہاں ESCAPE نہیں ہے IDEALISM نہیں ہے، جیسے ایک بڑی خوش آئند قسم کی تصویر ہو REALITY سے آنکھیں پھیر کے۔ اس کے یہاں ایسے شعر ملتے ہیں جس میں انسان کی ازلی تقدیر اپنے حقیقی روپ کے اندر ہمارے سامنے آتی ہے۔ پھر میں فارسی ہی کا شعر پڑھوں گا:

دل مایوس را تسکیں بہ مردن میتواں دادن

چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

یا یہ شعر ہے:

ریگ در بادیۂ عشق روانست ہنوز
تا چہا پائے دریں راہ بہ فرسودن رفت

تو، میں سمجھتا ہوں کہ، غالب کی عظمت کو اگر SUM-UP کیا جائے تب تو سب سے بہتر طریقے سے خود سرور صاحب بیان کر چکے ہیں اور مجھے پھر غالب کا شعر یاد آتا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان کا اردو شاعری کو ایک ذہن عطا کرنا، اور سوچتا ہوا ذہن عطا کرنا!

ایک چیز کا اس میں اور اضافہ کر دیا جائے۔ اس سے بعض لوگ یہ سمجھیں گے کہ غالب نے اپنے زمانے میں جو جدید رجحانات تھے ان کو اپنی شاعری میں INTRODUCE کیا، اور اس لحاظ سے انھوں نے اردو کو ایک ذہن دیا۔ بلکہ میں اس سے بھی آگے یہ کہوں گا کہ غالب کے یہاں ایک ایسا بھی SUBTERRANIAN CURRENT ملتا ہے کہ جو ان کے زمانے کے بعد کے امکانات رکھتا تھا، جو آج مقبول ہوا۔ اور ابھی اور بھی ایسے امکانات ہیں کہ آگے بھی پھل پھول نکلتے رہیں گے اور لوگ اس سے اپنے حسب استطاعت محظوظ ہوتے رہیں گے۔ ہر دور اور ہر GENERATION اپنے مطابق اس کا INTERPRETATION کرے گی، میرا خیال ہے کہ یہی غالب کی عظمت ہے۔

ایک چیز اور عرض کرنا ہے کہ:

غالب کے ہاں تصوف جہاں بھی آیا ہے وہ روایتی انداز میں آیا ہے۔ کم از کم انیسویں صدی تک ہمارے یہاں تصوف برائے شعر گفتن خوبست کے تحت، ہمارے شعرا اس کو اپنے یہاں بطور فیشن کے استعمال کیا کرتے تھے، اور مضمون باندھا کرتے تھے۔ اصل میں نقد و نظر کی صحیح آزمائش وہیں ہوتی ہے جہاں کہ ہم کسی شاعر کے یہاں یہ پہچاننے میں کامیاب ہو جائیں کہ اس کے یہاں روایتی ELEMENT کیا ہے اور کہاں اس کی صحیح آواز ہے جو کہ بالکل نئی ہو کے سامنے آئی۔ غالب نے خود اپنے فارسی کلام میں اس کی تردید کر دی ہے:

تصوف نزیبد سخن پیشہ را
سخن پیشہ رند کژاندیشہ را
نشاں مسند ایں روشنائی نہ
غزل خوان و مخمور سنائی نہ

تصوف کے بھی تو بہت سے پہلو ہیں۔ اب ظاہر ہے اس زمانہ کا جو فکری سرمایہ تھا اس پر تصوف کے اثرات —— غالب نے خانقاہی زندگی تو نہیں گزاری تھی۔ لیکن تصوف سے متاثر تھے

وحید اختر:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ع ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

کرمانی: یہ شعر غالب کے DOMINANT رنگ کو REPRESENT نہیں کرتا۔

سرور: اگر غالب کے عقیدے پر آپ غور کریں تو زندگی میں خاصے آزاد منش آدمی تھے لیکن اگر عقیدے کا معاملہ لیجئے تو ایک توحید کا، موحد کا، عقیدہ ملتا ہے حضرت علی سے عقیدت ملتی ہے؛ اور، باقی، اللہ اللہ خیر صلا۔

کرمانی: نہیں؛ وہ تو ان کی نجی زندگی کی بات ہے۔

وحید اختر: یہ وارث کرمانی صاحب نے جو شعر پڑھا

رنج اندیشہ' والا، تو غالب کج اندیشہ تھے اس لئے پوری طرح سے مذہب کے دائرے میں اپنے آپ کو فٹ نہیں کر سکے۔ تو تصوف برائے شعر گفتن، نہیں تھا بلکہ ضرورت تھی ان کے لئے: اس لئے کہ وحدت الوجودی کے تصور میں اتنی گنجائش تھی کہ مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی بہت آزاد ——— تو تصوف ان کی ضرورت کو پورا کرتا تھا، کج اندیشگی اور آزادہ روی جو تھی غالب کے مزاج میں۔

وارث کرمانی: غالب کی شاعری میں تصوف اتنا زیادہ متضاد ہے ان کے پورے شعری رجحان سے کہ ——— میرا خیال ہے غالب کو میکیاویلین MECKIAVELLIAN کہنا زیادہ مناسب ہے۔

خلیل اعظمی: دیکھئے، ایک فرق ہے۔ غالب صوفی شاعر نہیں تھا، لیکن اس کا جو پورا فکری پس منظر ہے وہ تصوف کا ہے۔ غمگین دہلوی وغیرہ کے نام جو خطوط ہیں اس سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے اچھا مطالعہ کیا تھا تصوف کا؛ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے سن لیا تھا افواہ کے طور پر تصوف کے بارے میں۔

حسن عسکری: مثنوی چراغ دیر دیکھئے تصوف پر کتنی گہرائی کے ساتھ لکھا ہے۔

اعظمی: جی ہاں۔ اور اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ شیخ اکبر کا تصور کیا تھا۔ غالب کو پورا علم تھا اور حالیؔ نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ شیفتہ کہہ رہے تھے کہ تصوف پر میں شاہ ولی اللہ کا ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ ایک نہایت مشکل مقام تھا میں کئی دن سے فکر میں تھا۔ غالب آئے، انھوں نے باتوں باتوں میں ایسا سمجھا دیا کہ پانی کر کے رکھ دیا! شاید شاہ ولی اللہ بھی اس سے بہتر نہیں EXPLAIN کر سکتے تھے۔ یہ شیفتہ کا بیان ہے تصوف پر۔

سرور: وارث صاحب نے بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں یہ کہ ہم غالب کے فکر کو اور غالب کے فن کو الگ کر کے دیکھیں، اور پھر مربوط کریں۔ میرا خیال ہے اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ ہماری شاعری، بڑی حد تک، جذبہ کی شاعری ہے، اور جذبہ کی زبان تھی۔ یا پھر زبان اس قسم کی تھی جہاں پر کہ قصیدوں میں آپ محض ایک خیال بندی کر لیتے تھے، اور وہ بھی گویا ایک روایت ——— لیکن غزل کا جو سرمایہ تھا وہ جذبہ کی شاعری تھی۔ اب غالب کے یہاں سوال یہ بنتا ہے کہ چوں کہ محض جذبہ نہیں ہے ان کے یہاں، بلکہ فکر جذبہ بنتی ہے، جسے میں نے FELT THOUGHT کہا، ——— اب آپ اُسے چاہے INTELECTUALELEMENT کہہ لیجے چاہے اس کو TOTAL INSIGHT کہہ لیجے، چاہے اس کو RECEPTIVE TO THE FUTURE کہہ لیجے جب وہ میلان آئے گا تو اس کے لئے وہ زبان تو بنائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں یہ کارنامہ ان کا خاص طور پر ہے کہ اُردو شاعری کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ان افکار ہی کو نہیں، بلکہ برابر جو افکار آتے جائیں ان کو ادا کر سکے؛ اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ غالب کا بہت بڑا احسان ہے اردو شاعری پر۔

اعظمی: اقبالؔ کا بہت مشہور شعر ہے:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکُوْن

اس پر خواجہ منظور نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ اگرچہ اقبالؔ کا شعر بہت اچھا ہے لیکن اس سے بہتر شعر غالب کا ہے کہ:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اور یہ شعر بھی تصوف ہی کی دین ہے۔

سرور: غالب نہ ہوتے تو اقبال کا وجود ہی نہ ہوتا

کرمانی: اگر آپ غالب کی عشقیہ شاعری کو دیکھیں تو اس سے تصوف کا جو ATTITUDE ہے اس کی نفی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا معشوق کے ساتھ جو گفتگو کا انداز ہے، اور جو BARGAINIG ATTITUDE ہے وہ آپ غور کیجئے۔

'ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے' SECULARISATION اور ارضیت میں ٹھیک ہے لیکن یہ تصوف کی مسکینی، اس کی افتادگی، اس کی ——

'دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے'؛ اور پرستش بھی کرتا ہے، تصوف کا بھی ——

سرور: اس کی وجہ میں بتاؤں آپ کو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب ایک نہیں ہیں، غالب بہت سے غالب ہیں۔ تو جو بات آپ کہہ رہے ہیں وہ 'دامن کو حریفانہ' بھی کھینچتا ہے اور پرستش بھی کرتا ہے؛ اور تصوف کا بھی دلدادہ ہے۔

کرمانی: مگر وہ جسم کی پرستش کرتا ہے FLESH BLOOD کی پرستش کرتا ہے۔

سرور: مگر وہ جو شعر اس کا ہے:

'نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں'

اس میں دماغ کا لفظ اگر نہ ہوتا تو یہ شعر وہ نہ ہوتا۔ 'دماغ' سے ظاہر —— ایک صاحب نے ایک مضمون لکھا 'غالب کی قنوطیت'، غالب کی قنوطیت —— تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مثلاً کوئی شخص اگر یہ کہے کہ غالب ہماری جنگ آزادی کے بہت بڑے سپاہی تھے تو یہ غالب کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور جنگِ آزادی کے ساتھ بھی۔ اس میں جنگِ آزادی کی کوئی توہین نہیں ہوتی ہے کہ غالب —— غالب بے چارے اس معاملے میں بالکل معذور تھے

اعظمی: غالب کا وہ شعر:

'دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے'، نہ ہوتا تو اقبال کا وہ شعر وجود میں نہ آتا:

'یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک'

وحید اختر: غالب اور اقبال کے بارے میں، عظمت کے سلسلہ میں، ایک بات اور ہے:

کہ اقبال کے بہت سارے تصورات: عشق کا، خودی کا، زمانے کا تصور یہ BORROWED ہیں۔ اقبال نے تو باضابطہ پرانے اور اپنے زمانے کے فلسفیوں کا مطالعہ کیا اور ان کے خیالات لے لئے۔ لیکن غالب کے یہاں ہم کو کوئی تصور BORROWED نہیں ملے گا INDIRECTLY اثر تصوف کا یا اس زمانے کے جو اور رائج فلسفے تھے ان کا ہو سکتا ہے لیکن اقبال کی طرح، جہاں بتا سکتے ہیں کہ اس نے نیٹشے سے، برگساں سے، کانٹ سے، ہیگل سے، یہاں یہاں BORROW کیا ہے، یہاں یہ نہیں کہہ سکتے کہ غالب نے کسی سے BORROW کیا ہے۔ اس سے ان کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔

بلکہ اقبال میں جو شوخی ہے کہ:

'محشر میں نہ بیٹھے گا فارغ تو جنوں میرا'،

یا 'باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں'

ان سب کے ابتدائی نقوش غالب کے یہاں، ملتے ہیں۔

[ایک آواز: اور وہ 'تو شب آفریدی چراغ آفریدم']

ان سب کے نقوش غالب کے یہاں ملتے ہیں؛ اور اقبال کے یہاں مجھے لگتا ہے کہ غالب ہی کے یہاں سے آئے ہیں۔



شہریار

۸

غالب کے بعد میں آنے والا ذہن جو تھا اُس کو سوچنے اور محسوس کرنے کے لئے جس زبان کی ضرورت تھی وہ غالب نے فراہم کی جیسا کہ ابھی سرور صاحب نے کہا ہے؛ اور گھوم پھر کے ہم غالب ہی کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔

فکری اعتبار سے بھی غالب کا بہت اثر رہا ہے۔ اور جیسا کہ خلیل صاحب نے کہا زندگی کا کلی تصور جو ہے وہ غالب سے پہلے نہیں ملتا، اور یہ تضادات جو ہیں یہی ان کی عظمت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب وہی

ہے جس کی طرف وحید صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ وہ UNCOMMITTED تھے۔ کسی ایک نظریئے کو، یا کسی ایک فلسفے کو، یا ایک عقیدے کو، اگر وہ ––– COMMIT کر لیتے تو ان کی نظر میں ایک گہرائی آ سکتی تھی زیادہ شدت آ سکتی تھی، لیکن وہ وسعت اور تنوع نہ آ پاتا جو غالب کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

آل احمد سرور: یہ جو بات آپ نے کہی ہے کہ UNCOMMITTED تھے وہ۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ HE WAS THE ONLY TRUE COMMITTED POET, COMMITTED TO BOTH GOOD AND EVIL, COMMITTED TO THE BEST AND THE WORST COMMITTED TO THE HIGHT AND THE DEPTH

میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ جتنا COMMITTENT کا تصور ہے یہ غلط ہے یہ COMMITMENT پولٹیکل فلاسفی والا یہ COMMITMENT ہے ہی نہیں۔ REAL COMMTMENT TRUE شاعر کا جو ہے TRUE COMMITMENT WITH WHOLE OF LIFE, BOTH THE NON-CONFORMITY اور GOOD AND EVIL زیادہ صحیح ہے بلکہ ICONOCLAST بھی کہہ لیجیے بت شکن۔ مطلب آپ کا بھی غالباً یہی تھا۔ THE ONLY TRUE COMMITTED POET IN URDU IS GHALIB! COMMITTED TO THE WHOLE OF LIFE!!

وارث کرمانی: HE WAS NOT COMMITTED IN THE SENSE IN WHICH IQBAL WAS COMMITTED

شہریار: غالب کی شاعری میں انسان کا بہت ہی اعلیٰ اور ارفع تصور ہے، اس تصور کا سلسلہ ظاہر ہے مذہب سے جا کے ملتا ہے۔ اس اعتبار سے غالب کا انسان کا جو تصور ابھرتا ہے وہ خاصا عیار آدمی ہے جو اس زمانے کی صحیح نمائندگی کرتا ہے

آل احمد سرور: عیار کے بجائے ہوش مند کیوں نہیں کہتے۔

شہریار: نہیں یہ تو کچھ DIGNIFIED ہو گیا۔ میرا مطلب ہے وہ CALOUS ہو گا خاصا! اپنے فائدے کے لئے ––––

اعظمی: جو رگوں میں دوڑنے پھرنے کی بات کرے آپ اُسے عیار نہیں کہہ سکتے۔! بس وجدان کم، عقل زیادہ!

شہریار: غالب کی شاعری سے جو لوگ متاثر ہوئے وہ اس زمانے کے سب سے ENLIGHTENED لوگ ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ قدروں کا احساس اس طرح سے نہیں دے پاتی غالب کی شاعری جیسے مثال کے طور پر میر کی شاعری دیتی ہے۔ میر کی شاعری کو پڑھ کر انسان سے جس قسم کی محبت ہوتی ہے اور اس کے لئے قربانی کا جذبہ یا اس قسم کی چیز میں ––––– یہ غالب کی شاعری سے نہیں ہوتا، بلکہ اس میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا تو اس چیز میں فائدہ نہیں ہے، چاہے سماج کا فائدہ ہو یا نہ ہو! اس قسم کا ان کے خطوط سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں بھی یہ چیز ہے

آل احمد سرور: یعنی اگر آپ یہ کہیں کہ بعض قدروں کے لحاظ سے میر بڑے ہیں تو میں مان لوں گا، لیکن اگر مجموعی طور پر کہیئے تو ––––––

شہریار: قدروں کا جو تصور رہا ہے، مثلاً نیکی کا تصور تھوڑا بہت بدلتا رہے گا۔ لیکن دوسرے کے لئے قربانی کر سکے، دوسرے کے دُکھ درد کو دیکھ سکے، اپنے فائدے کو کہیں SURRENDER کرے، تو غالب کے یہاں یہ بہت کم ہے۔!

▲▲



کوثر چاند پوری

٩

غالب کی عظمت اور ذہانت، دو چیزیں اس وقت زیرِ بحث ہیں۔ اِن دونوں کو سمجھنے کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ ذرا سی تفصیل میں ہمیں جانا ہوگا۔

غالب اپنی شخصیت کے اعتبار سے، اور اپنی ذہانت کے اعتبار سے، اور اپنی فنکاری کے اعتبار سے، بڑی متضاد شخصیت کے مالک ہیں۔ اور مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ تضاد ہی ان کی عظمت اور انکی شخصیت کو بلند کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر یہ تضاد ان کے اندر نہ ہوتا تو یقیناً وہ اس عظمت کے اور اس شہرت کے، اور اس مقبولیت کے، مستحق نہ ہوتے جس کے وہ آج سمجھے جا رہے ہیں۔ غالب کی خوش قسمتی کہیے یا بد قسمتی سمجھیے، کہ انہیں ہمیشہ دو قسم کے ناقدین ملے ہیں جنہوں نے بہت ہی مختلف انداز سے، بہت ہی متضاد انداز سے، ان کی شخصیت پر، ان کے فن پر، اور انکے فن کی بلندی پر گفتگوئیں کی ہیں؛ ایک گروہ تو وہ ہے جو انہیں پیغمبر اور اوتار بنا کر پیش کرتا ہے، اور جو تمام خوبیاں ان کے کلام میں دیکھ لینا چاہتا ہے۔ انکے اس دیوان کو، جو چند اجزا ہی پر مشتمل ہے کتاب ایزدی تصور کر کے اس کا احترام کرتا ہے۔ اور جیسا کہ میں عرض کر رہا ہوں کہ وہ ہر چیز اس میں ڈھونڈ لینا چاہتا ہے جو یقیناً غالب کے تصور میں اس وقت نہیں تھی: اس میں شک نہیں کہ منطقی اصول سے علتِ غائی اور علتِ فاعلی کے اعتبار سے، پہلے علت صوری ہوا کرتی ہے؛ تصور اس کا ذہن میں آتا ہے، اس کے بعد، اس کی کوئی صورت، کوئی شکل، بنتی ہے۔ اس اعتبار سے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ سب چیزیں غالب کے دماغ میں موجود رہی ہوں گی، لیکن غالبًا ایسا نہیں ہے؛ وہ سب چیزیں یا نہ ہوں گی۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو غالب کی عظمت کو ناپنے کے لئے، اور ان کی فنکاری کی پیمائش کرنے کے لئے تنقید کا ایک وہ پیمانہ رکھتا ہے کہ جو یورپ میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ وہ غالب کے کلام میں کسی مخصوص پیغام کی تلاش کرتا ہے، اور جب وہ پیغام اُسے نہیں ملتا غالب کے کلام میں، تو مایوس ہو کے وہ کہہ دیتا ہے کہ غالب بڑا شاعر نہیں ہے، اور کوئی مرتبہ اس کا شاعری میں نہیں ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو لوگ غالب کو پیغمبر سمجھ کر گفتگو کرتے ہیں، وہ غالب کی بڑی شدید توہین کرتے ہیں۔ شاعر کا یا فنکار کا یہ سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ انسان ہو، انسانی سطح پر ہو، اور انسانی سطح پر رہ کر ان مسائل کو سمجھے جو کسی سماج کو درپیش ہوں، یا اس کے ان ساتھیوں کے سامنے جو مشکلات ہوں ان کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ ایک پیغمبر بن کر کوئی شاعر یا فنکار ہماری دُنیا سے الگ ہو جاتا ہے، ہماری دُنیا سے کٹ جاتا ہے، ہماری کائنات سے الگ ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ماورائی ہستی بن جاتی ہے جس سے کم سے کم ایسا کوئی شخص بحث نہیں کرے گا جو اپنی زندگی سے اُنس رکھتا ہے۔

غالب کی عظمت کو اور غالب کی ذہانت کو سمجھنے کے لئے دو تین چیزوں کی بڑی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کی شخصیت کو ناپا جائے، اس کا جائزہ لیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اس تعلق کو دیکھا جائے جو انہیں اپنے سماج کے ساتھ تھا؛ یا جس نقطۂ نظر سے انہوں نے اپنے سماج کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ تیسری چیز غالب کی عظمت کو سمجھنے کے لئے ان کا اسلوب۔

جہاں تک ان کی شخصیت کا سوال ہے، غالب کی شخصیت، سب جانتے ہیں کہ، نہایت گوشہ دار تھی، نہایت تہ دار تھی؛ اور میں اپنے الفاظ میں یہ کہتا ہوں کہ غالب کی شخصیت ایسے پردوں میں، ایسے خولوں میں، ایسی تہوں میں، لپٹی ہوئی تھی جن کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جب کوئی پرت، یا جب کوئی تہ، غالب کی شخصیت سے اتاری جاتی ہے، تو ایک نیا غالب جلوہ گر ہوتا ہے، جو اپنے اوصاف کے لحاظ سے، اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

ایک غالب تو وہ ہے جو اپنے دوستوں سے ہنس کر باتیں کرتا ہے؛ اور ایک حیوان ظریف کی حیثیت سے خود بھی ہنستا ہے، دوسروں کو بھی ہنساتا ہے؛ ایک غالب وہ ہے کہ جو دوسری یا تیسری تہ سے برآمد ہوتا ہے، جو اپنے ممدوحین کی شان میں مدحیہ قصائد کہتا ہے اور پھر صلہ جوئی کی تمنا رکھتا ہے۔ بلکہ اپنے الفاظ میں کبھی کبھی وہ دریوزہ گری کی شرمناک حرکت میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے، اور وہ بڑی صفائی کے ساتھ اپنے ممدوح کی تعریف کرتا ہے، صلہ چاہتا ہے؛ اگر صلہ نہیں ملتا، تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جھلاہٹ میں آکر وہ ہجو بھی کہہ ڈالتا ہے۔

اور ایک غالب وہ ہے جو اپنے مخالفین، اپنے حریفوں، کے مقابلے میں صحیح معنی میں شاہنامہ کا ایک رزمیہ کردار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور بڑے رجزیہ انداز میں انہیں مخاطب کر کے کہتا ہے:

من آنم بنیروے ایں تیغ تیز ... کہ مغز عدو را کنم ریز ریز
عدو آں کہ برہانِ قاطع نوشت ... بگفتارِ سست و بہنجارِ زشت

کیا قصور غریب برہان قاطع کے مصنف کا تھا کہ غالب اس کے سر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں؛ لیکن یہ وصف تھا غالب کی اس عسکریت کا، اس سپاہی زادگی کا جس پر انہوں نے جگہ جگہ فخر کیا ہے۔ بلکہ اس حد تک فخر کیا ہے وہ سپاہی زادگی کی طرزِ گفتار کو اپنی ذات کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔ دوسرا حریف جب انکے سامنے بات کرتا ہے اور سختی سے گفتگو کرتا ہے تو اس پر افسوس کرتے ہیں کہ تم سپاہی زادے نہیں ہو، یہ طرزِ گفتگو تو میرے لئے ہے۔

اور بھی غالب کے پہلو ہیں۔ ایک غالب وہ ہے جو بڑی تنظیم، تواتر اور تسلسل کے ساتھ ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ جن میں حزن و ملال کی کیفیت ملتی ہے، یاس و قنوط کی کیفیت ملتی ہے۔ یہاں پھر اسے اس ناقد سے واسطہ پڑتا ہے جو اسکے فن کو ناپنے کا مغربی پیمانہ لئے سامنے موجود ہے؛ اور جو قنوط اور رجائیت کا صرف یہ تصور رکھتا ہے، اس انداز نظر کو جانچنے کا کہ جو شخص کمی کا شکوہ سنج ہو اور جتنی چیز اسے میسر ہے اس پر وہ کفایت نہ کرے، قناعت نہ کرے، اسکے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ قنوطی انداز نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک شعر غالب کے یہاں اس قسم کا اس ناقد کو مل جاتا ہے:

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

جتنی شراب میسر ہے، بھری ہوئی اسکے سامنے ساغر میں رکھی ہے، وہ اس پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ کہتا ہے

کہ گلاس اتنا خالی ہے۔ یہ اندازِ نظر ایسا ہے کہ قنوطی شاعر میں ہی پیدا ہو سکتا ہے، کسی رجائی شاعر کا یہ اندازِ نظر نہیں ہوا کرتا۔ لیکن دوسری پرت سے جو غالب برآمد ہوتا ہے وہ صحیح معنی میں رجائی حیثیت رکھتا ہے، ایک رجائی شخصیت رکھتا ہے، اور جب وہ کوشش اور جدوجہد کے میدان میں کھڑے ہو کر کہتا ہے:

بوادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت است
بسینہ راہ می سپرم اگرچہ پا خفت است

ایسا شاعر جو ایسا گرم پیغام دے، جو زندگی کی اتنی توانائی بخشے، جس کے لب و لہجہ میں اتنی حدت ہو، اتنی گرمی ہو کہ اس کے پیر اگر تھک جائیں تو وہ سینے کے بل چل کر منزل پر پہنچنے کی کوشش کرے، ہرگز اس کا مستحق نہیں ہے کہ اسے قنوطی کہا جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ غالب کی شخصیت خود نہایت متضاد ہے۔ وہ پست بھی ہیں ایک جگہ، اور وہ بلند بھی ہیں؛ وہ قنوطی بھی ہیں اور وہ رجائی بھی ہیں۔ جہاں تک سماج کو سمجھنے کا تعلق ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ نہایت ذہین تھے، بڑے جینیس تھے۔ انہوں نے اپنے سماج کا جائزہ بڑی دانشوری کے ساتھ لیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب وہ مرزا عبدالقادر بیدل کے رنگ میں شعر کہا کرتے تھے۔ وہ اشعار ان کے بڑے مشکل اور نہایت دقیق ہوتے تھے۔ لوگ، اس سماج کے جس میں یقیناً پڑھے لکھے لوگ تھے، اس زبان کو سمجھتے تھے جس میں غالب شعر کہتے تھے، وہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کا استہزا کیا جاتا تھا، بر سرِ مشاعرہ انہیں برا کہا جاتا تھا، لوگ الجھتے تھے۔ ہر چند وہ مرزا عبدالقادر بیدل کے پیرو تھے، لیکن اس کا خود انہیں اعتراف ہے کہ وہ ریختہ میں طرزِ بیدل کو نباہ نہیں سکے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

اس قیامت کے میدان میں وہ زیادہ دور تک چل نہیں سکے۔ ایک وقت آیا کہ انہوں نے اپنے سماج کی آواز سُنی۔ عبدالقادر بیدل اس میں شک نہیں کہ فارسی کے شاعر تھے، اُردو کے چند شعر ہی ان سے منسوب ہیں۔ لیکن جہاں تک فارسی زبان کا تعلق ہے وہ بڑے نادرہ کار قسم کے شاعر تھے؛ بڑی گہرائی تھی، انکے خیال میں؛ بڑی گہرائی تھی۔ غالب نے اُردو میں صحیح معنی میں ان خیالات کی ترجمانی نہیں کی جو مرزا بیدل کے خیالات تھے۔ فارسی میں ضرور انہوں نے اس قسم کے اشعار کہے ہیں جن میں کسی قسم کا اُلجھاؤ نہیں ہے۔ چنانچہ ایک شعر ان کا اس وقت مجھے یاد آرہا ہے:

گلت را نوا از گست را تماشا
تو داری بہارے کہ عالم ندارد

اس قسم کے اشعار فارسی زبان میں کہنے والا جب بیدل کے رنگ میں ریختہ میں شعر کہتا ہے تو وہ اُلجھ جاتے ہیں، پیچیدہ ہو جاتے ہیں، معمہ بن جاتے ہیں؛ لوگ ان کو سمجھتے نہیں۔ لیکن غالب نے اپنی دانشوری سے اپنے سماج کی نفسیات کو سمجھا، معاشرے کے رجحان کو سمجھا، اور اس بات کو محسوس کیا کہ جس معاشرے میں میں جی رہا ہوں، یا جس معاشرے میں مجھے اپنی وراثتِ شعری چھوڑنا ہے، وہ ایسا نہیں ہے کہ اس لب و لہجہ کو برداشت کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خوش قسمتی تھی غالب کی کہ انہیں کچھ دوست ایسے مل گئے جو سخن سنج بھی تھے اور ارباب ذوق میں بھی ان کا شمار تھا۔ انہوں نے ان کی رہنمائی کی، اور غالب نے اس رہنمائی کو قبول کیا اور بڑے

اچھے انداز سے قبول کیا۔ اگر ابتدائی زمانے کے اشعار کو اس زمانے کے اشعار سے ملا کر دیکھا جائے جن میں غالبؔ سنبھل گئے تھے' اور جن میں انہوں نے اُردو کے

مزاج کو سمجھ لیا تھا اور اپنے سماج کی نفسیات کو سمجھ لیا تھا تو ان میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ میں چند اشعار اس زمانے کے پیش کرتا ہوں جب وہ بیدلؔ کے رنگ میں کہہ رہے تھے۔ یہ اشعار وہ نہیں ہیں جو نسخۂ حمیدیہ میں شامل ہیں اس صورت سے کہ آج اگر انہیں بیان کر دیا جائے تو ایک مضحکہ ثابت ہوں۔ اور اس زمانہ میں یقیناً وہ مضحکہ ہی تھے۔ لیکن جیسا کہ غالبؔ نے اپنے خطوط میں تذکرہ کیا ہے' بہت ممکن ہے کہ میرے مطبوعہ دیوان کے متن کو چھیل کر انہوں نے تو بڑی سخت گالی دی ہے کسی بیہودہ شخص نے اس کلام کو شامل کر دیا ہو میں نے ایسے اشعار نہیں کہے ہیں بہرحال دو شعر اس زمانے کے پیش کر رہا ہوں۔

دریا بساط دعوت سیلاب ہے اسدؔ
ساغر بہ بارگاہِ دماغ رسیدہ کھینچ
اگر آسودگی ہے مدعائے رنج بے تابی
نثار گردش پیمانۂ مے روزگار اپنا

ان اشعار پر اگر پڑھنے والا غور کرے' کافی وقت صرف کرے' تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان معانی کی تہ تک نہیں پہنچ سکے گا جو غالبؔ کے ذہن میں تھے۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ یہ ایک قسم کا معمّہ ہیں' اور ایسے اشعار ہیں جن کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔

لیکن جب غالبؔ نے اپنا رنگ سخن تبدیل کیا'

اور جب انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم سماج کو صحیح طور پر اسی وقت مخاطب کر سکتے ہیں جب اسکے مزاج کو سمجھ لیں' اس کی نفسیات کو سمجھ لیں' اور اُس زبان کے مزاج کو' اس کی روایات کو سمجھ لیں جس میں ہم شعر کہنے والے ہیں' تو انہوں نے یقیناً ایسے اشعار کہے جو سہل ممتنع کی تعریف میں آتے ہیں' اور جن کو کسی اعتبار سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اُلجھے ہوئے ہیں یا ان میں کوئی دقت ہے' کوئی مشکل ہے۔ چند اشعار میں اس دور کے پیش کروں گا:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا' اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اور ان کے نادرہ کار اسلوب کے سلسلہ میں مزید یہ شعر:

کہتے ہیں نہ دیں گے دل الخ قفس میں مجھ سے الخ
نہ کرتا کاش نالہ الخ رہے اس شوخ سے آزردہ الخ
وہ بادۂ شبانہ کی الخ غم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب الخ
دہر جز جلوۂ الخ پوچھ مت وجہ سیہ الخ آرائش جمال سے فارغ الخ



سید احتشام حسین

(۱۰)

لطیف صاحب

نے ایک کتاب سنہ ۲۸ء میں لکھی تھی جو آپ سب کے مطالعہ میں آچکی ہے۔ اور انھوں نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا تھا کہ غالب بڑے شاعروں میں نہیں شمار کئے جاسکتے۔ یہ ایسی بات ہے جسے غالباً ہم میں سے کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جناب عباسی صاحب کا یہ سوال کہ عظیم شاعر کسے کہتے ہیں، اس کا آسانی سے ہم جواب نہ دے سکیں۔ لیکن یہ ایسا احساس ہے ہم لوگوں میں، کہ غالب بڑے شاعر تھے۔

ان کے بڑے شاعر ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ ہر دل عزیز شاعر ہیں؛ اور جو زبان انھوں نے اب سے سو برس پہلے اختیار کی تھی، وہ زبان آج بھی ہم اختیار کئے ہوئے ہیں، اور ان کے اشعار، معلوم یہ ہوتا ہے، آج ہی غالب نے بیٹھ کر لکھے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ غالب کو اپنے اردو کلام پر نہیں بلکہ فارسی کلام پر ناز تھا۔ لیکن ان کا ایک شعر ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ:

پوچھے جو کوئی ریختہ کیوں کر ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

انھیں اپنے اردو کلام پر بھی ناز تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے اردو کلام کی خوبی کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اس قدر مقبول ہیں:

جیسا کہ ...... بیدار صاحب نے اپنے مقالے میں کہا ہے ان کے کلام کو مختلف حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے مثلاً تصوف کے رنگ میں، فلسفہ کے رنگ، یا سہل ممتنع۔ رات میں نے سرسری طور پر دیوان اٹھایا اور یہ دیکھنا چاہا کہ ایسے کتنے اشعار مجھے ملیں گے جنھیں روزانہ

گلی کوچوں میں پڑھے لکھوں کی زبان سے سنتا رہتا ہوں۔ مجھے قریب دس فی صد اشعار ایسے ملے، یعنی ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر۔ وہ میں نے لکھ بھی لئے ہیں۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ یہی وہ اشعار ہیں جو غالب کی مقبولیت کی دلیل اور بنیاد ہیں۔ میں ان میں سے کچھ اشعار پڑھ کر سناؤں گا۔ ان میں کچھ اشعار ہیں، اور کچھ مصرعے ہیں؛ لوگ مصرع عام طور پر پڑھ دیتے ہیں پورا شعر نہیں پڑھتے:

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

ع یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

ع اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

ع اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ع لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

ع کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ع کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ع میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ع خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

ع کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ع دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ع میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

ع شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ع رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

ع میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ع تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

ع ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

ع مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

ع صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

ع غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

ع وہ اپنی خو نہ بدلیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

ع تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

ع عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ع ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں

ع عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

ع ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

ع ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

ع اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ع اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

ع پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

ع کوئی صورت نظر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ

شرم تم کو مگر نہیں آتی

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ع مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

ع اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ع اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنھ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ع کام وہ اچھا ہے جس کا کہ مآل اچھا ہے

ع جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

ع ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ع رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

ع تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

ع وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا

دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ع آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

ع آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

غرض کہ غالبؔ کے مروجہ دیوان میں جس میں قریب ۱۸۰۰ اشعار ہیں ان میں مجھے ۱۸۰ اشعار ایسے ملے کہ جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں کسی شاعر نے کہے ہوں گے، اور وہ ہماری زبان پر رہتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ غالبؔ کی عظمت کی دلیل ہے۔

یہ اشعار واقعاتی ہیں جو مختلف جذبات اور احساسات کے تحت اور حادثات سے دوچار ہونے پر دفعتہً ہماری زبان پر آجاتے ہیں۔ اب یہ اشعار ہماری روزمرہ کی گفتگو کا جز بن چکے ہیں اور ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

سید امیر حسن عابدی

(۱۱)

ایک ہمارے ہاں رجحان ہے کہ غالب یا اقبال پر لکھنا ایک فیشن ہو گیا ہے، یعنی جتنا غالب یا اقبال پر ہمارے یہاں لکھا جا چکا ہے اتنا ایران میں حافظ یا فردوسی پر لٹریچر موجود نہیں ہے۔ بہت سے لوگ بطور فیشن کے اس قسم کا کام کرتے ہیں۔

میں نے برہان قاطع کے ایرانی ایڈیشن کے مرتب اور اپنے استاد ڈاکٹر معین سے پوچھا کہ غالب کی قاطع برہان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ آغا! غالب ۹۰ فیصد صحیح نہیں ہیں۔ اس لئے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ غالب کے ساتھ ایک گروہ تھا، اور اس گروہ کے ساتھ چلتے تھے۔ قاطع برہان میں بھی ایک گروہ ہندی کا عنصر پایا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک غالب کے فارسی کلام کا تعلق ہے میں نے ایران میں کوئی اس کی خاص عظمت نہیں دیکھی، بلکہ وہ پورا اسٹائل جس کو ہم سبک ہندی کہتے ہیں ایران میں اب بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ میں، اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھنا، اس کا بھی قائل نہیں ہوں لیکن ہم اصرار یہ کرتے ہیں کہ مثلاً اقبال کو ایرانی مانیں، یعنی جس کو ہم پسند کریں اس کو ایرانی بھی پسند کریں، تورانی بھی، افغانی بھی، تمام دنیا پسند کرے! تو میرے خیال میں یہ اصرار بھی غلط ہے۔ اور ایران میں ادب کی جو روایت ہے جس سے غالب نے بھی فائدہ اٹھایا ہے بلکہ اسی کی پیداوار ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ قطرہ اس دریا تک پہنچتے پہنچتے اس کی عظمت بہت کم ہو جاتی ہے۔ بہر حال جہاں تک فارسی کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ غالب کا کوئی بہت بڑا درجہ نہیں ہے۔ ▲▲



عبداللطیف اعظمی

١٢

موجودہ دور جو اُردو کا اچھا خاصہ ترقی یافتہ دور ہے وہ بہت سے شعراء کے لئے سازگار نہیں ثابت ہوا، غالب کے لئے زیادہ ہوا، لیکن میں نے شاعری سے زیادہ اُن کے خطوط میں خوبیاں دیکھیں ہیں یہ صحیح ہے کہ تضاد ہے: بہت ہی پریشانیوں کے لئے کہیں جھک بھی گئے ہیں وہ؛ لیکن میں ان کے خطوط جتنا ہی پڑھتا ہوں ان کی انسانیت دوستی اور بلندی کردار کا قائل ہوتا جاتا ہوں۔ بہت پریشان ہیں لیکن مدد کرنا، مختلف طریقوں سے، نقد سے بھی اور اپنے اثرات ورسوخ سے بھی؛ وہ ہر ایک کی مدد کرنا پسند کرتے ہیں۔ انسانیت دوستی کا رجحان آج کل کا محبوب موضوع ہے، لیکن غالب کے یہاں آج سے سو سال پہلے ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن میں ہیومنزم بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سو سال بعد تک کی چیزیں اُن کے یہاں آگئی تھیں۔ میرے خیال میں ان کے دور کے کسی شاعر کے یہاں شاید یہ چیزیں نہ مل سکیں۔ بہت سی چیزیں اُن کی ہیں؛ مثلاً شعراء میں رقابت، ایکدوسرے کو نیچا دکھانا۔ ایک دوسرے کی تعریف نہ کرنا۔ لیکن غالب کے یہاں بہت تعریف ملتی ہے۔ کافی بڑھاتے ہیں، اپنے شاگردوں کو بھی بڑھاتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو جو انہوں نے خط میں لکھا ہے کہ تم تو بالکل مجھ جیسی عبارت لکھنے لگے ہو۔ اور اب میرے برابر ہو۔ اس قسم کی چیزیں اُن کے یہاں بہت ہیں اور یہی سب چیزیں ہیں: انسانیت ان میں جو تھی؛ کردار کی بلندی ہے؛ ایک دوسرے کے ساتھ پیش آنے میں، سماج میں؛ جو درجہ اُنھوں نے اپنا پیش کیا ہے؛ غریبوں کی مدد؛ انسانیت دوستی؛ مسلم غیر مسلم، آج کل اس پر بہت زور دیا جارہا ہے لیکن اس وقت جو انھوں نے کہا تھا کہ میرے یہاں نصرانی، ہندو، مسلم، سب برابر ہیں، میں تو سب کو دوست سمجھتا ہوں، اُس وقت کوئی یہ پرابلم نہیں تھا جو آج کل پرابلم ہیں جس میں ہم یہ نعرہ لگاتے ہیں۔ لیکن غالب کے یہاں وہ چیزیں موجود ہیں۔ تو یہ سب چیزیں ہیں جن کی بناء پر میں سمجھتا ہوں کہ غالب کی عظمت کے قائل ہونے پر ہم مجبور ہوئے ہیں، کسی خاص وجہ سے نہیں۔

صالحہ عابد حسین

۱۳

پہلے تو میں یہ عرض کر دوں کہ میں کچھ قالین کے شیر کی طرح تھوڑی سی قلم کی شیر اپنے کو سمجھتی ہوں مگر تقریر کی شیر نہیں ہوں کہ وہ بھی منہ زبانی! بقول شخصے دوسری بات یہ کہ جب اتنے بڑے بڑے لوگ ماشاء اللہ اتنی تفصیل سے غالب پر کہہ چکے ہیں جو کچھ بھی میں کہنا بھی کچھ چاہتی تھی، تو سب کہا جا چکا ہے۔ خاص طور پر، میں نے ایک مضمون لکھا تھا' جو جامعہ میں چھپا تھا' جس میں غالب کے روزمرہ اور محاورے' اور ہر بے تکلف' موقعوں پر جو ان کے اشعار پڑھے جاتے ہیں' اس پر یہ مضمون میں نے لکھا تھا۔ وہ موضوع بھی میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔

لیکن میں اس وقت سے سوچ رہی تھی کہ غالب کی عظمت سے کیا مطلب ہے۔ یعنی بحیثیت اردو شاعر کے وہ عظیم ہیں یا نہیں؟ یا یہ کہ بحیثیت انسان کے وہ عظیم ہیں یا نہیں؟ یا بحیثیت مجموعی' غالب کو بذات خود' ہم عظیم شخصیت' عظیم انسان' اور عظیم فنکار مان سکتے ہیں یا نہیں؟

اگرچہ میں اس سے متفق ہوں کہ آجکل غالب پرستی ایک فیشن بن گیا ہے۔ آجکل سے میرا مطلب' یہ صدی جو منائی جا رہی ہے' اس سے نہیں؛ جب سے 'مرزا غالب' فلم بنا تھا' اور جب سے ثریا کی آواز میں لوگوں نے غالب کی غزلیں سنی تھیں؛ جنھوں نے غالب کو مقبول کرنے کے لئے بڑا کام کیا۔ میں اپنی دوست حمیدہ سلطان کی طرح' اس فلم کے خلاف نہیں ہوں؛ میں سمجھتی ہوں کہ غالب کو عوام سے روشناس کرانے میں اس فلم کو بہت حصّہ ہے۔ (قاضی صاحب: یہی میں نے ان سے کہا تھا) لیکن' اس کے باوجود مجھے ذرا تکلیف اور افسوس ہوتا ہے جب میں ان لوگوں کو غالب پر اپنے کو حرفِ آخر کہنے والا سمجھتی ہوں جو غالب کے شعر صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ غالب کے شعر سمجھنا تو خیر بہت بڑی چیز ہے؛ وہ تو بہت گنتی کے' اوپر کے چند لوگ' سمجھتے ہیں؛ اور ہم جیسے بھی تھوڑے بہت ان کے اچھے شعر سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن' جس کو دیکھئے' صاحب' ہر شخص غالب' غالب' غالب؛ معلوم ہوتا ہے اردو میں کوئی دوسرا شاعر ہی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود غالب کی عظمت' اور غالب کے اشعار' اور غالب کا اردو کلام' اور خطوط — میں تو غالب کی خطوط نویسی کی بھی قریب قریب اتنی ہی قائل ہوں جتنی کہ غالب کے کلام کی۔

لیکن' خیر میں کیا اور میری رائے کیا' اتنے لاکھوں آدمی ان کے اوپر کام کر رہے ہیں؛ لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ میری رائے میں غالب کی' بحیثیت اردو شاعر' سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ وہ' عوامی شاعر ہیں یا نہیں ہیں عوام کے شاعر ہیں یا نہیں ہیں' یہ میں نہیں جانتی' اس وقت' عوام اور عوامی کا نام ہی کوئی نہیں جانتا تھا' غالب نے خود اپنے خطوط میں کہا ہے کہ یہ عوام جو ہیں بہت ہی گھٹیا درجہ کے لوگ ہیں' وہ تو خواص اور خواص الخواص کے لئے کہتے تھے' ایسے جو لوگوں کی سمجھ میں بھی نہ آئیں۔ شروع میں بیچارے نے کہا بھی یہ۔ لیکن وہ چونکہ ایسے نقاد تھے جو خود اپنے پہ تنقید کر سکتے تھے' میرا اپنا خیال یہ ہے' میں نے کہا بھی ہے

کسی جگہ، تو انہوں نے خود سمجھا کہ یہ جو خواص الخواص کے لئے میں شعر کہہ رہا ہوں، یہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے۔ اور ان کا جو تین چوتھائی یا آدھا کلام ہے، سلیس، بامحاورہ بڑی پاکیزہ حسین اردو میں، وہ بحیثیت اردو شاعر کے، غالب کی عظمت کی دلیل بھی ہے غالب کی عظمت کا ثبوت بھی ہے، غالب کی عظمت کو باقی رکھنے والی بھی ہے۔ اور یہ آج کی صدی، اور آج کے جلسے، اور ہم سب لوگوں کا غالب کو خراج عقیدت پیش کرنا سب اسی کی وجہ سے ہے۔

میں آپ سے یہ کہوں: کہ سب سے بڑی اسکی وجہ یہ ہے کہ کسی وقت جب کوئی گہرا رنج یا صدمہ یا خوشی یا کوئی کیفیت ہم پہ گزرتی ہے تو غالب کا کوئی شعر یاد آجاتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ گلیوں بازاروں ہی میں لوگ پڑھتے رہیں؛ نہیں صاحب، ہمارے دل پر گزر جاتی ہے وہ کیفیت۔ میں تو اپنی جانتی ہوں بات۔ میں نے بچپن سے حالی تو گویا اپنی ذاتی ملکیت تھے، لازمی تھا کہ پیدا ہوتے ہی مسدس حالی سننا اور پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ اقبال کا بڑا زور تھا ہمارے خاندان میں۔ اقبال کی عظمت کے بہت قائل تھے۔ اور بقول میرے شوہر کے کہ تم لوگ تو بس اقبال اور حالی ہی کے پرستار تھے۔ لیکن خدا جانے کیسے بچپن ہی سے غالب کے اشعار خود بخود یاد ہونے شروع ہو گئے جن کے معنی بالکل معلوم نہ تھے۔ دھیرے دھیرے، رفتہ رفتہ، جب کچھ تھوڑی بہت شُدبُد ہوئی تھی تو اس کو سمجھنے لگے۔ لیکن اس وقت سے لیکے اب تک، غالب کے اشعار بچپن سے تو نہیں مگر لڑکپن سے لیکے اب تک، ہر ایسے موقع پہ کوئی شعر دل پہ گزر جاتا ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے شاید میرے ہی لئے اس وقت کہا تھا! یا شاید میں نے ہی کہدیا!!

ایک بہت سخت حادثہ گزرا ہمارے خاندان پہ۔ میرے بھائی کی بیوی کا امریکہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ بہت سخت وقت تھا۔ آٹھ دن بعد ان کی لاش آئی۔ آپ یقین مانیے گا اس زمانے میں مستقل میرے ذہن پہ غالب کا یہ شعر مسلط تھا کہ:

رگ و پے میں جب اترے زہر غم، تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

ابھی میرا بازو ٹوٹ گیا تو لیٹے لیٹے فوراً ذہن میں یہ آیا کہ

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

میرے ایک بہت پیارے عزیز کا انتقال ہوا تو میرے ذہن پہ یہ شعر مسلط تھا کہ:

پھر ترا وقت سفر یاد آیا

تو ایسے کتنے ہی شعر ہیں، دل پہ کیفیت گزرتی ہے جن لوگوں کو تھوڑے بہت غالب کے اشعار یاد ہیں۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے دلی جذبات اور کیفیات کو انہوں نے اس طرح ڈوب کے کہا ہے کہ جس وقت ہم پہ کوئی گہری کیفیت گزرتی ہے، خوشی کی، غم کی، فکر کی، پریشانی کی، تو ہمیں مومن کا شعر نہیں یاد آتا ہمیں ذوق کا شعر، کم سے کم مجھے، نہیں یاد آتا! ہمیں اور بڑے بڑے شاعر گزرے ہیں؛ ہر شاعر اپنی جگہ پہ بہت بڑا ہے، دکوئی یاد نہیں آتا، انیس کے شعر یاد آتے ہیں، غالب کے شعر یاد آتے ہیں، جب کوئی گہرا جذبہ آپ کے دل پہ گزرتا ہے، اور غالب کی عظمت کے لئے یہ اتنی سی ہی چیز کافی ہے، بہت زیادہ بحث میں جانے کی میرے خیال میں ضرورت ہی نہیں ہے۔

۱۴ عبدالخالق نقوی

غالب نے اپنے زمانہ میں ایسی باتیں کہیں کہ جو اس زمانے کی باتیں نہیں تھیں۔ اور جو اس زمانے کی عام روش تھی۔ غالب نے اس روش سے ہٹ کر ایک دوسری روش اختیار کی جس کی اس زمانہ میں قدر کی جا رہی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کمال ہے۔ ورنہ تقلید، اور ایک دوسرے کے کہے ہوئے کے جیسے اشعار کہنا، یا اپنے زمانے کے عام رنگ کی پیروی یا تتبع کرنا، یہی عام طریقہ ہے، لیکن غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ غالب نے اس عام رنگ سے ہٹ کر شعر کہے۔ اب یہ بات کہ غالب نے کچھ دوسرے شعرا کے فارسی اشعار کا ترجمہ کر دیا ہے تو میرا خیال ہے کہ کوئی شاعر ایسا نہیں بچے گا، اگر آپ تلاش و جستجو کریں، کہ اس جیسا مضمون دنیا کی کسی نہ کسی شاعری میں، کسی نہ کسی شاعر کے یہاں نہ مل جائے۔ اب بالارادہ وہ ایسا ہوتا ہے، یا اتفاق ہے، توارد ہے کیا ہے؛ لیکن اس سے غالب کی بڑائی کم نہیں ہو جاتی۔

اب رہی غالب کی یہ حیثیت کہ غالب بہت بڑے فیاض تھے، تو میں سمجھتا ہوں غالب کی بڑائی اس میں نہیں ہے اگر وہ حاتم ہوں؛ اور موجودہ چیزیں وہ نہ ہوتے تو میں سمجھتا ہوں غالب کی کوئی بڑائی نہ ہوتی۔ حاتم تھا ایک شخص؛ اس کی بڑائی تھی۔ لیکن غالب کو ہم جس اعتبار سے بڑا سمجھتے ہیں۔ وہ اس کا فن ہے؛ وہ اس کی اپنی الگ روش ہے جو اس نے اختیار کی۔ اور وہ باتیں کہیں جن کو بعد میں آنے والے لوگ APPRECIATE کرتے ہیں؛ آج کے لوگ ان چیزوں کو پسند کرتے ہیں۔

غالب کہتا ہے کہ

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کو دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یہ ہے غالب کا فن۔ اور غالب کا آرٹ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ غالب نے معمولی سطح کے شعر نہیں کہے ہیں۔ ایسے بھی کہے ہیں، لیکن اُن کی وجہ سے غالب، غالب نہیں بنا ہے؛ غالب بنا ہے اس قسم کے اشعار کی وجہ سے، اس کا انداز بیان، اور اس کی تراکیب جو اس نے اختیار کی ہیں۔

وہ کہتا ہے:

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

یہ ہے غالب کی عظمت کی نشانی!

اس پر بھی گفتگو کی جاتی ہے کہ غالب فارسی کا بڑا شاعر تھا یا اردو کا بڑا شاعر تھا، میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر غالب بڑا تھا تو وہ اردو میں بھی بڑا تھا، اور فارسی میں بھی بڑا شاعر تھا لیکن ہمارے یہاں چونکہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اب اردو ہی نہیں رہی، فارسی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تو فارسی کو سمجھنے والا کون ہوگا، اور فارسی میں کس طریقے سے ہم اس کی داد دے سکیں گے۔

اب اس کو اس پیمانے پر ناپنا کہ چونکہ ایران والے غالب کی فارسی کو نہیں مانتے۔ اس لئے غالب فارسی کا بڑا شاعر نہیں ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہی الفاظ اور وہی محاورے اور وہی ترکیبیں جو حافظ نے، سعدی نے، فردوسی نے، اور بڑے بڑے اساتذہ نے فارسی کے استعمال کی ہیں، وہ جب ہمارے ہندستان کا کوئی آدمی استعمال کرتا ہے تو ایران والے یہ کہہ دیں کہ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے، یہ سبک ہندی ہو گیا، حافظ کہتا ہے تو سبک ایرانی ہے۔ لیکن، ہندستانی آدمی اسی چیز کو کہتا ہے تو وہ سبک ہندی ہو جاتا ہے۔ یہ اُن کی زیادتی ہے، ہندستانیوں نے بڑی خدمت کی ہے فارسی کی۔ اتنی اچھی اچھی فرہنگیں تیار کیں، ایران کے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زبان کو بگاڑ دیا، یہ اُن کی زیادتی ہے۔

سید عابد حسین

(۱۵)

مجھے غالب کے کلام سے تو ہمیشہ سے ایک ذوق رہا ہے اور کچھ خیالات بھی میں غالب کے بارے میں رکھتا ہوں۔ کچھ متفرق اور منتشر خیالات میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اچھا ہوا ترمذی صاحب نے اس بات کو صاف کر دیا کہ غالب کی عظمت کا جب ذکر ہو تو پہلے یہ طے ہو جانا چاہئے کہ عظمت کس حیثیت سے!

[مالک رام، ترمذی نہیں، ان کا نام ظلق عباس عباسی.
عابد حسین، نہیں انھوں نے نہیں ترمذی صاحب نے فرمایا تھا (عابد صاحب، نقوی صاحب کو ترمذی صاحب کہہ رہے تھے!]

تو میرے خیال میں اسوقت کا موضوع تو شاید یہی ہے کہ غالب کی عظمت بحیثیت شاعر کے. اب اس میں یہ کہ، غالب کی شخصیت. تو ایک حد تک شخصیت کا تعلق ہوتا ہے، مگر اتنا گہرا تعلق نہیں ہوتا کہ کوئی عظیم شاعر نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ عظیم انسان نہو ورنہ پھر بہت سے شاعروں کو شیکسپیر سے لے کر اب تک عظیم شاعروں کے زمرے سے خارج کرنا پڑے گا اور پھر اس میں شخصیت کے بہت سے پہلو آتے ہیں شخصیت کی عظمت کا معاملہ بھی بہت ہی پیچیدہ ہے، اس کا طے کرنا بہت پیچیدہ ہے. شاعر کی بھی شخصیت میں اتنی عظمت تو ضرور ہوتی ہے کہ وہ انسانی فطرت کو اس طرح سمجھتا ہے جس طرح دوسرے نہیں سمجھتے۔

میرے خیال میں شاعر کی عظمت کا معیار بحیثیت شاعر کے، بحیثیت فنکار کے، اگر تفصیل سے گفتگو کی جائے تو اس کے بہت سے پہلو نکلیں گے، لیکن سب سے اہم پہلو جو ہیں، کہ ایک شاعر کی عظمت کن چیزوں سے ہوتی ہے، تو میرے خیال میں وہ دو چیزوں سے ہوتی ہے. پہلی چیز تو یہی ہے کہ وہ انسانی فطرت کو اچھی طرح سمجھتا ہو انسانی فطرت کا رمز شناس ہو، ان باریکیوں پر اس کی نظر پہنچتی ہو جہاں تک دوسروں کی نہ پہنچتی ہو، ایک چیز ہے

(۱۵)

دوسری چیز یہ ہے کہ جو بات اس نے لکھی ہے اس کو وہ ایک اس انداز میں پیش کر سکے جس میں خوبصورتی ہو جس میں دلکشی ہو: اس کو وہ بیان بھی کر سکے۔ بہت سے لوگ ہیں، جو سمجھتے ہیں جن پر کیفیتیں گزرتی ہیں، لیکن ان کو بیان نہیں کر سکتے، ادا نہیں کر سکتے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ اس کو بیان کر سکتا ہے۔ غالب نے خود کہا ہے کہ:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور یہ 'جانا' کی بات نہیں ہے، وہ بھی میرے دل میں ہوتا ہے، لیکن میں اس کو کہہ نہیں سکتا، اس کو ادا نہیں کر سکتا۔ تو یہ ہے چیز کہ شاعر کی نظر پہنچتی ہے انسانی فطرت کی باریکیوں تک، اور وہ اس کو الفاظ میں بیان کر سکتا ہے، اور اس طرح بیان کر سکتا ہے کہ دوسروں کو معلوم ہو کہ وہاں جو کیفیت ہمارے دل پہ گزر رہی ہے جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے اس کو شاعر نے بیان کر دیا۔ تو اس کی زبان سے سنکر لطف آتا ہے۔

پھر دوسری چیز ہوتی ہے فرد کی، کہ بیان کرتا ہے وہ۔ اس بیان میں حسن ہوتا ہے، ایک دلکشی ہوتی ہے، خوبصورتی ہوتی ہے۔ پھر وہ کن چیزوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس کے بھی بہت سے پہلو ہیں۔ اور اس میں بھی جو خاص چیزیں ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک تو حسن ہوتا ہے آواز کا، صوتی حسن! اہلِ فن جانتے ہیں کہ الفاظ کی ترتیب اس طرح سے ہو کہ خود کانوں کو اچھی معلوم ہو۔ یہی راز ہے موسیقی کی مقبولیت کا، دلکشی کا، یہی ہے شاعر کا۔

پھر یہ کہ اس میں تشبیہہ و استعارہ سے لطف پیدا ہوتا ہے۔ ایک چیز کو ایک دوسرے پیرایہ میں بیان کرنا ایک ایسی چیز سے تشبیہہ دینا جس سے ہم زیادہ مانوس ہیں، تو وہ تصور ہمارے ذہن میں اچھی طرح سے آجاتا ہے، بیٹھ جاتا ہے، یہ تشبیہہ و استعارہ کا لطف ہے۔ اگر تشبیہہ و استعارہ ایسا ہو کہ جس سے اور اس کا سمجھنا مشکل ہو جائے، بعید از فہم ہو جائے، تو وہ کوئی اچھا تشبیہہ و استعارہ نہیں۔ شاعری کی خوبی یہ ہے کہ تشبیہہ و استعارہ اس تصور کو ذہن سے قریب کر دے، اور ایک اس کا نقش، اس کی تصویر نظر کے سامنے پیش کر دے۔ یہ ایک خوبی بھی ہے۔

اب یہ کہ یہ خوبیاں غالب کے فارسی کلام میں زیادہ ہیں یا اردو کلام میں؛ غالب کی عظمت ان کے فارسی کلام کی وجہ سے ہے یا اردو کلام کی وجہ سے؟ میرا خیال ہے کہ وہ ان کے اردو کلام کی وجہ سے ہے۔ کس لئے، کہ فارسی میں غالب شاعر کم ہیں اور استاد زیادہ ہیں۔ وہاں پر جو اس زمانہ کا مذاق تھا: معنی آفرینی، نکتہ سنجی، بات کو بہت اہتمام سے کہنا، تو جو طرز اس زمانے میں مقبول تھا، رائج تھا، اس میں وہ کوشش کرتے تھے کہ وہی طرز ہو، اور خیالات میں جدت ہو۔ یعنی ایک مروجہ طرز کی پیروی کرنا۔ اور یہ کوشش کرنا کہ اس میں مقبول بھی ہوں، اور بیان میں بھی کوئی ندرت ہو۔ اس سے ایسا تکلف اور تصنع پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر اُسے اُستاد تو کہہ سکتے ہیں شاعر نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہم لوگوں کا مذاق ہے، آجکل کا ہے، اس زمانے میں یہ نہیں تھا۔ اُس زمانے میں تو وہی جس کے ہاں معنی آفرینی ہو جس کے ہاں نکتہ سنجی ہو، باریک مضمون ہو، اور اس کو ادا بھی کیا جائے بڑے اہتمام کے ساتھ، ترکیبیں نئی ہوں، استعارے نئے ہوں، تشبیہیں نئی ہوں، ان باتوں کی کوشش ہوتی تھی۔

لیکن غالب کی عظمت جیسا کہ کئی اصحاب نے فرمایا، ایک تو ان کے اردو کے شعروں کی وجہ سے ہے، اور وہ بھی ان کا آسان کلام سہل کلام۔ اور دوسرے ان کے خطوط کی وجہ سے ہے اس پر ترمذی صاحب نے فرمایا کہ وہ اپنے زمانے سے بہت آگے دیکھتے تھے، دیکھتے تھے، کہ لوگوں کا مذاق کیا ہونے والا ہے، یہ تو میں مانتا نہیں، میرے خیال میں یہ بات نہیں ہے۔ جو اردو خطوط ہیں، ان کا تو غالب نے خود ہی ذکر کیا ہے کہ مجھے اس زمانے

میں ہی خاندانِ مغلیہ کی تاریخ لکھ رہا تھا، فرصت ملتی نہیں تھی؛ کہ وہ بیٹھ کے فارسی میں عبارت آرائی کریں، تو وہ اُٹھ کے، بیٹھ کے، اور بے تکلف، اردو میں خط لکھ دیتے تھے. اور غالب ابتدا میں غالباً سمجھتے تھے کہ یہ تو کوئی چیز ہی نہیں ہے، یہ تو بس خط کا جواب دینے کے لیے لکھ دیا ہے. کوئی خاص — مگر جب انھیں کے زمانے میں ان کے خطوط کی بہت قدر ہوئی، پھر شاید غالب کو بھی یہ احساس ہوا، اور پھر انھوں نے اردو میں خطوط؛ زیادہ دلچسپی لی؛ زیادہ دلچسپی کے ساتھ لکھے! تو بہرحال، چونکہ اس میں تکلف نہیں تھا، بے تکلفی ہے خطوط میں، اسی سے ان کی گویا شخصیت آپ کے سامنے آتی ہے. ساری خوبیاں اس وجہ سے ہیں کہ بے تکلف، بے تصنع، انھوں نے کہا ہے۔

اسی طرح سے اردو کلام کے بارے میں بھی انھوں نے کہا کہ یہ کوئی چیز نہیں ہے، یہ تو میں نے ویسے ہی لکھ دیا ہے: "بے رنگِ منست"! اچھا! اردو میں بھی اگر وہ کچھ سمجھتے تھے تو وہ ان شعروں کو سمجھتے تھے جن کو کہ ہم آجکل کہتے ہیں کہ بہت پیچیدہ ہیں، مغلق ہیں، مطلب نہیں سمجھ میں آتا ہے. لیکن عظمت اس کی وجہ سے نہیں ہوئی، بلکہ ان کے جو اردو کے سادہ اور بے تکلف شعر ہیں. کیوں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی اپنی شخصیت بھی اسی میں جھلکتی ہے، انسان کے حقیقی جذبات بھی اسی وقت ادا ہوتے ہیں؛ جبکہ وہ کوئی بات بغیر تکلف اور تصنع کے کہتا ہے. تو، یہ غالب نے بامقصد اور بالارادہ، یہ سمجھ کر غالباً نہ اردو میں یہ خط لکھے ہیں نہ یہ سہل و سادہ کلام. بلکہ اس کو وہ سمجھتے تھے کہ روا روی میں کہہ دیے ہیں، یا مشاعرے میں پڑھنے کے لیے اچھے ہیں؛ لوگ یہی شعر پسند کریں گے. شاید اس طرح سے کہہ دیے! مگر یہ اتفاق ہی بات ہے، میرے خیال میں اتفاق کی بات نہیں ہے بلکہ ہونا ہی یہی ہے کہ بڑا آرٹ جس کو آپ عظیم آرٹ کہتے ہیں، وہ پیدا اسی طرح سے ہوتا ہے کہ اس میں تکلف اور تصنع زیادہ نہ ہو، بے ساختگی ہو؛ بے تکلفی ہو. اب اس کا معیار کیا ہے؛ کس طرح سے آپ کہیں گے؛ وہ یہ ہے کہ وہ خواص و عوام سب میں مقبول ہو. کیوں؛ اس لیے کہ انسانی فطرت کی مصوری اگر ہے، تو وہی فطرت خواص کی ہے وہی عوام کی ہے؛ جو انسانی فطرت ہے وہ تو سب میں مشترک ہے: فطرت جسے کہتے ہیں. ویسے تو خیر بہت فرق ہوتا ہے علم و فضل کا، اور دوسری چیزوں کا، جس کی وجہ سے ایک انسان ایک دوسرے انسان سے بڑھ کر ہے لیکن انسانی فطرت کی وہ چیزیں جو بنیادی چیزیں ہیں: کن چیزوں سے خوشی ہوتی ہے، کن چیزوں سے غم ہوتا ہے، کن چیزوں سے دل دُکھتا ہے، کن چیزوں سے تفریح ہوتی ہے، یہ تو سب مشترک ہیں. تو جب کوئی انسانی فطرت کی سچی مصوری کرے گا تو ہر شخص کو، اس میں خاص و عام کی قید نہیں، یہ محسوس ہوتا ہے کہ:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اچھا! اور یہ کہ خواص و عوام سب اس سے لطف اٹھائیں یہ اسی وقت ہو گا جب وہ سہل اور سادہ بے تکلف زبان میں کہا جائے۔

تو میرے خیال میں تو شاید یہ بات مسلّم ہے، اس میں غالباً زیادہ اختلاف نہیں ہے، کہ بڑا آرٹ، بڑی شاعری، وہی ہے جس میں انسانی فطرت کی مصوری اس طرح سے ہو کہ خاص و عام سب اس سے لطف اٹھائیں. یہی راز ہے شیکسپیئر کی عظمت کا، میرے خیال میں؛ اور یہی راز سب بڑے شاعروں کی عظمت کا ہے؛ غالب کا ہے. غالب کے علاوہ اور جو میرے خیال میں ہمارے ہاں بڑے شاعر ہیں جن کو، غالب نے بھی مانا ہے اپنے سے بھی بڑا شاعر مانا ہے، وہ میر ہیں، تو میر کے ہاں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے شعر جو ہیں ایسی چیز ہوتی ہے جس سے دل پر چوٹ لگتی ہے یہاں؛ خاص و عام، میر سب کے ہیں. بس یہ چند باتیں مجھے کہنی تھیں۔

١٦

واقعہ یہ ہے کہ میں اُسے اردو کا بہت بڑا شاعر سمجھتا ہوں، اس میں تو کوئی شبہ کی بات نہیں میرا اس کی سوانح عمری لکھنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ مجھے وہ شخص پسند ہے، اس کی شاعری پسند ہے۔ رہا یہ کہ کیوں پسند ہے؛ تو یہ بہت مشکل بات ہوتی ہے۔ مجھے ایک رنگ پسند ہے، دوسرے کو دوسرا رنگ پسند ہے؛ مجھے ایک کھانا پسند ہے، دوسرے کو دوسرا کھانا پسند ہے۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس کے لئے مجھے کوئی شرعی جواز پیش کرنا پڑے۔

کئی طرح کی باتیں کہی گئی ہیں: کہ وہ اپنے زمانہ سے آگے تھا: وہ نفسیاتی ماہر تھا؛ سب باتیں اپنی جگہ پر کسی حد تک صحیح ہیں۔ لیکن مجھے جو اس میں سب سے زیادہ پسند چیز ہے وہ یہ ہے کہ وہ انسانی جذبات کا ماہر ہے، اور وہ انسانی جذبات کو اچھے الفاظ میں، اچھی ترتیب سے پیش کرتا ہے۔ صالحہ بہن نے ایک بات کہی ہے کہ ہمیں غالب ہی کے کیوں شعر یاد آتے ہیں؟ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے دوسروں کے دیوان پڑھنے چھوڑ دیئے۔ اگر آپ دوسروں کے دیوان بھی اسی مزاولت سے پڑھیں، تو اُن کے شعر بھی آپ کو ضرور یاد آئیں گے۔ کسی اچھے گھر میں چلے جائیے۔ بتائیے کہ دہار آپ کو اردو کے اساتذہ میں سے کتنے لوگوں کے دیوان ملیں گے۔ بجز بہت کم! حالانکہ آپ لوگ خود جانتے ہیں کہ میر سے، میر کے زمانے میں سودا ہوا۔ درد ہے؛ یہ قد مار میں سے آپکو ملیں گے۔ خود میر کے زمانے میں میر، مومن، غالب، ذوق، لکھنؤ میں ناسخ، آتش، اور ان کے شاگردوں میں سے، کتنے لوگوں کے دیوان چھپے ہیں؛ اور اچھے اچھے شعر ہر ایک کے دیوان میں ہیں۔

غالب کے دیوان میں جو خاص طور پر بات ہوئی، وہ اُس کا انتخاب ہے۔ اتفاق سے غالب کا دیوان شروع سے منتخب آگیا؛ دو ہزار شعر نہیں ہیں اس میں! اس کو پڑھنا بھی آسان؛ اور تین درجن شرحیں اس کی لکھی ہوئی؛ ان کا سمجھنا بھی آسان جو دوسرے شاعروں کے ساتھ نہیں ہوا، اگر یہی بات دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوتی تو غالباً اُن کے شعر بھی آپکو اُتنے ہی یاد رہتے۔ آپ نے صرف غالب کا اور انیس کا نام لیا۔ انیس اس وجہ سے کہ آپ مرتبہ بڑھانا چاہتی ہیں؛ غالب اس لئے کہ وہ بقول شخصے فیشن بھی ہوگیا ہے، اور آسان بھی ہوگیا ہے۔ اگر دوسرے شاعروں کا بھی اتنا ہی مطالعہ کیا جاتا، تو ان کے بھی شعر یقیناً یاد آتے۔ مجھے ذوق کے بھی بہت شعر یاد آتے ہیں۔ تو میرا مقصد یہ کہنے کا ہے کہ بہت شعر یاد آنا یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ وہ تو مزاولت کی بات ہے؛ آپ کے مطالعے پر منحصر ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی میں غالب کی عظمت، شعری عظمت کا قائل ہوں۔ اردو میں واقعی وہ ایک خاص موڑ پر آگیا، اور وہ پرانا ڈھرا بالکل ختم ہوکر اس نے ہماری شاعری کو ایک نیا رُخ دے دیا۔ خوش قسمتی سے اسی وقت انگریز آگئے تھے؛ انگریزی کی تعلیم شروع ہوگئی تھی؛ لوگوں کا مزاج مغربیت سے متاثر ہوگیا تھا؛ اس کی تسکین کی لئے غالب کے کلام نے مدد دی، ہمیں۔ یہ ایک اور اس کے اعتراف کا، ایک سبب بن گیا کہ لوگوں میں

انگریزیت آگئی؛ انگریزی خیال آگئے، مغربی شعراء کا کلام، ان کی تحریریں مطالعہ میں آگئیں، پھر اس کے علاوہ، آزاد اور حالی کی اصلاحی تحریک، جو مغربیت ہی کا اثر تھا، وہ بھی اس کے بعد آئی؛ اور حالی تو خیر شاگرد بھی تھے غالبؔ کے۔ تو ان سب باتوں نے غالبؔ پر توجہ زیادہ کردی؛ اور چونکہ اس شخص کے اندر خود بھی عظمت ہے، اس لیے لوگوں نے اُسے بہت عظیم شاعر مان لیا؛ اور غالباً اور زیادہ مان لیں گے۔

(بحث کے دوران:۔

ایک اور بات بھی ہے، آپ دیکھیں گے کہ اُس نے بہت کم غزلیں دوسروں کی زمینوں میں کہی ہیں غالبؔ کے دیوان میں بہت کم غزلیں ایسی ہیں جو کسی دوسرے کی زمین میں ہیں۔ تو، اس کے ذہن میں ایک اپج ہے؛ وہ نئی چیز پیدا کرسکتا ہے، اور کرتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے اس کی زمینوں میں غزلیں کہیں، لیکن اس نے خود بہت کم دوسروں کی زمینوں میں کہیں۔

ایک آواز: اردو میں یا فارسی میں؟

میں اردو کی بات کر رہا ہوں۔ فارسی میں اس کی خواہش یہ ہے کہ اساتذہ کی ___

قاضی صاحب: اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے، یعنی ان کا مزاج یہ ہے، کہ میں ہر معاملہ میں دوسروں سے مختلف ہوں۔ ایک خط میں ہے نا وہ ان کے کہ:

داڑھی رکھی تو سر منڈایا۔

یہ ہے نا! آپ سب لوگوں کے ذہن میں ہوگا، تو، ہر معاملہ میں وہ یہی کیا کرتے تھے۔ اب محض معمولی سی بات ہے کہ آپ خدا کہتے ہیں، بولتے ہیں نا اردو میں؛ وہ خدائے لکھیں گے؛ یعنی، یے جو ہے، غلط نہیں ہے یہ، لیکن یہ کہ فارسی میں بھی ان کے زمانے کے لوگ جو ہیں وہ اس قسم کے الفاظ کے آخر میں یے نہیں استعمال کرتے تھے ایک بالکل معمولی سی بات ہے، اس سے کوئی خاص بات نہیں نکلتی ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں میں اسی طرح استعمال کروں گا۔ لوگ عام طور سے سفارش۔ بولتے ہیں نا! وہ پ سے لکھتے ہیں اس کو۔ غلط ہرگز نہیں ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیوں لکھے کوئی۔ وہ یہ ہے کہ میں آپ سے مختلف ہوں؛ بس یعنی مرنا تک گوارا نہیں تھا انھیں (دوبلے عالم میں)

ابھی ڈاکٹر محمد صادق صاحب کی ایک کتاب HISTORY OF URDU LITERATURE اردو لٹریچر پر انگریزی میں چھپی ہے۔ اسمیں انھوں نے، خیر ان کی تمام آراء سے تو مجھے اتفاق نہیں ہے، مگر یہ کہ پریسٹلے نے جو میریڈیتھ کے بارے میں لکھا ہے وہ APPLY کیا ہے غالبؔ کے اوپر۔ پریسٹلے نے میریڈیتھ پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں میریڈیتھ میں بھی یہی مادہ تھا ایک MEGALOMENIA ہو گیا تھا کہ میں ہر معاملے سے دوسروں سے مختلف رہوں۔

ضیاء الحسن فاروقی: توارد کے بارے میں بھی آپ کو یاد ہوگا وہ شعر: ___

کہ اگر کہیں توارد ہے بھی تو از نہاں خانہ ازل زدرست
___ تو ازل میں چرا لیا تھا اس نے!

قاضی صاحب: چرا لیا تھا! جی ہاں۔

گوپال متل: یہ تو حق ہے شاعر کو، تعلی کا

قاضی صاحب: اتنا ہی، جتنا، مجھے یا آپ کو! دیکھیے نا! نظم میں اگر تعلی کا حق حاصل ہے تو نثر میں کیوں نہ ہو؟



۱۷

میں سمجھتا ہوں کہ اردو شاعری کے ساتھ ساتھ
اردو کے ان کے خطوط بھی توجہ طلب ہیں، آپ نے
جو مختلف باتیں اُن کی عظمت کے بارے میں چھیڑی ہیں
مناسب ہیں۔ لیکن میں تو متاثر ہوا ہوں بہت ان کے
اُردو خطوط سے۔ جس چیز نے مجھ پر سحر کیا ہے وُہ اُن کے
اردو رقعات ہیں۔

اردو اشعار بہت اہم ہیں بہت اچھے ہیں

لیکن ان کے معاصرین میں یا ان کے بعد اور شعراء کے یہاں بھی آپ کو ایسے اشعار مل جائیں گے۔ میرے خیال میں ان کی شاعری میں فارسی شاعری کی زیادہ اہمیت ہے۔ فارسی شاعری کی طرف توجہ زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اب اس بات کی ضرورت ہے کہ خاص توجہ کی جائے۔ غالب کو اپنی زندگی میں ہمیشہ اس بات کا احساس رہا کہ اس کو جو اصل عظمت ہے، وہ فارسی شاعری میں ہے۔ لیکن لوگوں نے اس کی اردو شاعری کی طرف توجہ کی۔ اب آہستہ آہستہ یہ پرچھائیں ختم ہو رہی ہے۔ اور اس کی فارسی شاعری کے بارے میں لوگ متاثر ہو رہے ہیں، ایران میں اور یہاں بھی۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ ایران والوں نے پورے طور پر ان کی عظمت کا اعتراف کر لیا ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ غالب کو جب مجموعی طور پر دیکھیں گے اور تجزیہ کریں گے کہ کن چیزوں نے غالب کی عظمت میں اضافہ کیا ہے تو سب سے پہلی چیز میرے خیال میں، ان کی فارسی شاعری آتی ہے۔

لغات کے بارے میں جو اُن کا علم ہے ہاور

لغات نویسی کے بارے میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، اس کی بھی اہمیت ہے۔ لیکن ایسے اور مصنفین بھی مل جائیں گے آپ کو جن کے ہاں .... ملتے ہیں، لیکن فارسی شاعری میں جو کچھ کمال انھوں نے حاصل کیا ہے اس کی طرف توجہ کا موقع ابھی نہیں ملا ہے۔

مرتب:

فارسی شاعری کی طرف توجہ بھی نہیں دی ہے، اس کو پڑھا بھی نہیں گیا ہے؛ تو، اس کے باوجود اسکی عظمت کا نقش بیٹھا ہوا ہے لوگوں کے دلوں پر، پھر کیا یہ صحیح بات نہیں ہے، کہ یہ اُردو کی وجہ سے ہے؟

نہیں، فارسی کلام بھی لوگوں نے آخر پڑھا ہے، ہاں اُردو کی وجہ یقینی ہے۔ اردو کا کلام ان کا بہت سائر و دائر ہوا ہے، تمام لوگوں نے پڑھا ہے۔ مگر اسمیں بھی ان کی فارسی شاعری کے اثرات تو ملتے ہیں

مرتب: مگر جو لوگ مانتے ہیں غالب کو، وہ اردو ہی کی وجہ سے مانتے ہیں، فارسی کلام تو اتنا پڑھا نہیں گیا ہے۔ تو اس حصے میں عظمت کی کیا وجوہات ہیں۔؟ کیا باتیں ہیں اس کلام میں جن کی وجہ سے غالب اردو کا ایک بڑا شاعر بن گیا ہے؟ یہ سوال بار بار اُٹھ رہا ہے اُس زمانے میں جب ہم غالب صدی منا رہے ہیں۔

اُردو شاعری کی جو اہمیت ہے، اپنی جگہ پر وہ تو ہے؛ مگر جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا تھا، اردو نثر نویسی کی طرف جو قدم اٹھایا ہے غالب نے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اردو رقعات میں آپ عدیل و مثیل نہیں دیکھیں گے غالب کا! اُس زمانہ میں اور لوگوں نے بھی خطوط لکھے ہیں؛ بے خبر ہیں، رجب علی سرور ہیں لیکن جو انداز غالب کا ہے وہ عجیب و غریب ہے، بہت ہی دل نشین! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے واقعی، سامنے بیٹھا ہے وہ، اور گفتگو کر رہا ہے؛ جیسا کہ اپنے خطوں میں بھی بارہا اس نے اظہار کیا ہے۔

[مرتب: تو آپ کے خیال میں شعر سے اس کی عظمت کافی نہیں ہے |

مکمل تصویر جو بنتی ہے غالب کی عظمت کی،

اسمیں اسکی اردو شاعری اور اردو خطوط نویسی دونوں کو دخل ہے۔ میں یہ نہیں مانتا ہوں؛ اس کے اردو رقعات اگر آپ نکال لیں تو اس کی عظمت اتنی زیادہ نہیں رہے گی۔

[مرتب: اور خود شعر؟ شعر میں کون سے ایسے عناصر ہیں جو اُسے دوسرے شاعروں سے اس درجہ ممتاز کرتے ہیں کہ وہ اُردو شاعر کی حیثیت سے عظیم بن گیا ہے، وہ عناصر یا عنصر، جو الفاظ کی گرفت میں نہ آسکے تو اشعار سے مثالیں دیکر ہی واضح کر دیجئے۔]

اس کی عظمت میں کوئی شبہ نہیں ہے بلاشبہ یقیناً وہ عظیم شاعر تھا۔ اردو کے چند شاعروں میں آپ اس کا شمار کریں گے: میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ اور یقیناً اس کی اُردو شاعری کے بارے میں کسی ایک بات کا کہنا آسان نہیں ہے کہ اس کی خاص وجہ کیا ہے: اس کی بلندیٔ تخیل ہے، زبان ہے، فارسی کے شعراء کا رنگ بسا ہوا ہے، بیدلؔ وغیرہ، اُن کے اثرات آتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہیں۔ سہل ممتنع بھی ہے۔ — جذبات کا اظہار ہے، اور وہ ساری چیزیں ہیں جو اچھی شاعری کے لئے ضروری ہیں۔

[مرتب: کچھ شعر، جو اس کی عظمت کو واضح کر سکیں؟ اور وہ شاعر جو یہ شعر کہہ سکے، وہ یقیناً عظیم شاعر ہی کہہ سکتا ہے، ایسے کون سے شعر ہو سکتے ہیں جو آپ کی عظمت کے تصور کو واضح کر سکیں؟]

جی ہاں۔ اس کا کلام بھرا ہوا ہے ایسے اشعار سے! آپ دیوانِ غالب نکال کر دیکھیں گے تو ورق ورق پر، دو چار شعر آپکو ضرور مل جائیں گے۔ میرؔ کی طرح نہیں ہے کہ پانچ سات صفحے الٹ جائیں کبھی کبھی کچھ بھی نہیں ملتا۔ غالبؔ کے یہاں ایسی بات نہیں ملے گی۔ کوئی ورق بھی آپ الٹ جائیں ان کے دیوان کا ایسے شعر آپ کو مل جائیں گے۔

[اعجاز عسکری: غالبؔ اور اقبالؔ پر جو بے جا زور دے دیا گیا ہے، آرزو صاحب، اس کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے۔ اردو غزل میں کچھ اور بھی شاعر بستے ہیں جنہیں کوئی نہیں پوچھتا، غالبؔ کا ایک اہم معاصر مومن ہے، اور ہیں —]

اس سلسلہ میں ایک بات ضرور کہوں گا، آپ کا مطلب یہ ہے کہ پروپیگنڈہ زیادہ ہوا ہے غالبؔ کا۔ خود میں نے اکرام صاحب سے جب وہ علی گڈھ آئے ہوئے تھے جب پوچھا تھا کہ غالبؔ پر کیا کر رہے ہیں تو انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگے۔ نہیں صاحب: اب میں غالبؔ پر کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ غالبؔ پر کام اسقدر ہو رہا ہے کہ اس میں دوسرے نظر انداز ہو گئے ہیں۔ اور میں بھی یہ سمجھتا ہوں۔ میں تو غالبؔ کی مداحی میں بہت بدنام ہو چکا ہوں۔ اور زندگی صرف کی ہے میں نے لیکن اور بہت سے لوگ ہیں جن پر کام ہو سکتا تھا اور نہیں ہوا۔ جس لئے توجہ کی غالبؔ ہی کی طرف توجہ کی۔ یقیناً غالبؔ میں کچھ ایسی باتیں ہیں بھی؛ مسائل ہیں اس کی زندگی ہے جو جس طرح گذری مثلاً مومنؔ کی تو اس طرح نہیں گذری، شخصیت کی بات آجاتی ہے۔

اب مثال کے طور پر آپ سے کہوں کہ ۱۹۳۶ء میں غلام رسول مہرؔ نے جو غالبؔ پر کتاب لکھی تھی اور سفرِ کلکتہ کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اب خود میرے پاس اتنا نیا مواد اس بارے میں جمع ہو گیا ہے، کہ ایک پوری کتاب ہو گئی ہے۔

سید احتشام حسین

۱۸

[مرتب: غالب کو آپ اتنا عظیم نہیں سمجھتے، لیکن جتنا بھی ہے کیا اہمیت ہے اس کی آپ کے خیال میں؟]

غالب ہماری تحقیق و تنقید کے لئے 'مئے مرد افگنِ عشق' کا درجہ رکھتے ہیں۔۔

آپ نے وہ شعر سُنا ہے جلیل مانک پوری کا کہ:

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہیں مگر دیکھنے کی تاب نہیں

تو غالب کا بھی یہی ہے نہ یہ، نہ یہ، نہ یہ لیکن ــــــ بعض آدمیوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ناک نقشہ، اور آنکھیں، چہرہ مہرہ سب بہت حسین ہوتے ہیں؛ لیکن جو COMBINATION ہے ــــــ دوسری طرف آنکھ ناک، کان بجائے خود خوبصورت نہیں، مگر وہ COMBINATION ایسا کہ بڑی کشش ہوتی ہے۔ غالب میں بھی یہی ہے کہ تمام چیزوں کو دیکھئے بحیثیت شخص کے یا ــــــ تو معلوم ہوتا ہے بہت سے جھول ہیں؛ لیکن جو COMBINATION آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے ایسا کوئی آدمی ہے ہی نہیں۔ چہرہ آفتاب نہیں، مگر دیکھنے کی تاب نہیں۔ یہ شخص جہاں پیدا ہوا نہ نظیر اکبر آبادی کا پیرو ہوا، نہ یہاں آیا تو ذوق و مومن کا پیرو ہوا؛ نہ لکھنؤ والوں پر کوئی نظر ڈالی؛ یہ بھی نہیں کہ بالکل فارسی ہی سے متعلق ہو۔ جتنا اُردو روزمرّہ پر عبور غالب کو تھا اتنا بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ اس طریقے سے ڈرامائی کیفیت پیدا کرتے ہیں اپنے اشعار میں کہ ــــــ دیکھنے تا کبھی، نہ ذوق نے اپیں کی نہ مومن نے، نہ نظیر اکبر آبادی نے۔

[مرتب: اب تو لوگ بجنوری کو بھی ــــــ کہتے ہیں کہ اس نے غالب کو پہنچا نہ اندازہیں آسمان پر ــــــ] آسمان پر اس نے آج سے ۶۰ برس پہلے کیا تھا۔ لیکن آسمان پر پہنچانے والے آپ ہیں یا وہ۔ آپ جو اُسے عالمگیر پیمانے پر تحریک ــــــ سب سے پہلے تو اسی شخص نے مغرب کے مفکروں کو غالب ہی کے ذریعے متعارف کرایا تھا ہندوستان سے؛ ورنہ کون جانتا تھا یہاں انھیں۔ اور آپ کہتے ہیں آسمان پر

پہنچا دیا۔ یہ علیگڑھ کا کمال تھا کہ سب سے پہلے غالب شناسی کی بنیاد اسی نے رکھی۔ بجنوری، سید محمود، حسرت، حامد علی، ذاکر صاحب! کسی نے بھی تو اتنا نوٹس نہیں لیا جتنا علی گڑھ والوں نے لیا۔ غالب پر شاید سب سے پہلی COMMENTARY حسرت ہی نے لکھی۔ غالب نہیں کسی بھی شاعر پر سب سے پہلی شرح! سب سے پہلی شرح غالب پر لکھی گئی اور وہ علیگڑھ میں لکھی گئی۔

آپ غور کریں کہ غالب پر جتنا احسان علیگڑھ والوں نے کیا —— یعنی خود حالی نے یہیں بیٹھ کے یادگارِ غالب لکھی۔ سر سید کے رفقا بھی سر سید تھے۔ سر سید وہاں کی سلطنت لائے، اور حالی وہاں کی INTELLECT لائے۔ تہذیب و سلطنت تباہ ہوئی اس کے لئے انھوں نے علیگڑھ میں اس سے بڑی تہذیب و سلطنت قائم کر دی جو کبھی فانی ہونے والی ہی نہیں؛ INTTLLECT وہاں کی جیسی بھی تھی غالب میں تھی، حالی اسے اٹھا لائے تو سر سید نے تو دو آثار الصنادید لکھیں۔ ایک دہلی میں، ایک یہاں۔ اور سر سید کا مشن قائم ہی نہیں ہو سکتا تھا اگر غالب کا کافر ذہن اور حالی کا مسلمان ذہن دونوں بیک وقت کام نہ کرتے! اور سر سید ہی کی ایسی دیو ہیکل جینئس تھی کہ دونوں کو ہم عنان رکھا۔ اور ہوتے تو بہ جاتے، اِس میں یا اُس میں!

بہت کم لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ غالب کو از سر نو زندہ کرنے میں علیگڑھ کا کتنا ہاتھ ہے! غالب میں مذہبیت تو بالکل ہے ہی نہیں۔ اور ایک زمانہ یہاں ایسا رہا کہ مذہبیت بالکل نہیں تھی۔ اب بھی ایسا ہے کہ نہیں بھی ہے تو دوسری طرف ہے بھی۔ آپ دیکھیں گے کہ غالب اور حالی کے PARALLEL ہے علی گڈھ کی آب و ہوا! ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے کو بالکل روشن خیال اور RATIONALIST کہتے ہیں، اور ایسے بھی ہیں جو اپنے کو مذہبی کہتے ہیں۔ یہ دونوں اسکول ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ یعنی وہ خالص ملحدانہ خیالات کے نہیں رہنے پائے DILUTE ہو جاتے ہیں، اور یہ مولویانہ نہیں رہ پاتے، ملحدانہ ہو جاتے ہیں۔ تو غالب کے انداز کو سب سے زیادہ مقبول بنایا ہے علیگڑھ نے؛ اور اب تک ——

—— ان کے زندہ رہنے کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے کہ یہی دو چیزیں تو چلیں گی: یزداں اور اہرمن! آپ علیگڑھ میں دیکھ لیں۔!

[مرتب: ایک صاحب نے ایک بات کہی تھی کہ غالب غالب اتنا زور بندھا کہ بقیہ لوگ نظر انداز ہو گئے حالانکہ—]

بھی، لیکن عوام ہی کے سامنے جانا پڑے گا۔ اور عوامی شاعر تو آپ انھیں کہہ نہیں سکتے؛ خصوصیت سے بھی زیادہ خصوصیت تھی ان میں۔ مگر نظیر اکبر آبادی استے عوامی ووٹ لائیں تو میں جانوں، حالانکہ وہ VERDICT عوامی شاعر ہیں، مگر کتنے عوام ان کے ساتھ ہیں اور کتنے خواص، جبکہ یہاں خواص اور عوام دونوں برابر برابر ہیں۔ یہی اقبال کے یہاں ہے۔ اقبال کے یہاں ذرا منظم فکر ہے اور فکر کو لوگ جلد قبول نہیں کرتے۔

[مرتب: ایک صاحب نے غالب کے سلسلے میں بہت اچھی بات کہی تھی کہ غالب نے اردو شاعری کو ذہن دیا۔ میرے خیال میں یہ بات بالکل صحیح ہے]

ذوق اور ذہن دونوں دیا! ذوق و ذہن، یا حسن و ہنر!!

—— اور سب سے بڑی بات غالب کے یہاں یہ بھی ہے، جو کم لوگ دیکھتے ہیں، کہ اس شخص نے جس طرح سے ایک پیغمبری آتی ہے تو پہلے کو منسوخ کرتی ہے اور آگے کی بشارت دیتی جاتی ہے، تو اس نے بشارت دی اقبال کے آنے کی!

'بر دار تواں گفت و بہ منبر نہ تواں گفت' یا 'آنکس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد'۔ اس کے ایسے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اقبال آنے والا ہے بعد میں۔ ورنہ اوروں کی اس سے پہلے شاعری معلوم ہوتا ہے ایک BLIND VALLEY میں ہیں، بالکل معلوم نہیں ہوتا ہے کہ آگے کوئی آنے والا ہے یا نہیں۔ نہ کسی کی شریعت منسوخ کی نہ کسی کی شریعت کی بشارت دی۔ لیکن غالب نے ——

[مرتب: اچھا یہ عجیب بات ہے غالب سے اتنا قریب اور غالب کا شاگرد اور غالب سے اتنا متاثر، حالی، اس کے یہاں غالب کا اثر اس طرح نہیں] مجھے تو حالی پر بہت ہی ایمان ہے بلکہ میں نے لکھا ہے نظام لکچر ز میں۔ سب کو جانے دیجئے، غالب کی جو تعریف حالی نے کی ہے انسانیت کا صحیح نمونہ، اور شاعری دونوں کا، ہم تو اس پر ایمان لاتے ہیں آپ نے غور سے پڑھا ہے جو غالب کا مرثیہ لکھا ہے حالی نے؟

حالی کو دیکھتے ہوئے کہ جو کبھی اپنے کو بے حجاب اور بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتا تھا، تضرع اور زاری میں بھی، جیسے بعض لوگ ہوتے ہیں نا، کیسا ہی حادثہ ہو جائے ان کے COMPOSURE میں کوئی فرق نہیں آتا۔ حالی کو دیکھئے اور وہاں اس کا بلبلا اٹھنا! جب میں اسے پڑھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے، یہ مرثیہ نہیں، یہ تو SENSE OF LOSS اور شخصی غم کا، ان دونوں کو ایسا لکھا ہے —— کہ ایسا معلوم ہوتا ہے ہر شخص حالی ہے اور ہر شخص غالب ہے۔ ان کی جدائی پر ایسی چیز لکھ دی ہے انھوں نے کہ اب یہ ہوا کہ —— ہر SENSE OF LOSS کے لئے ایک حالی بھی مقرر ہے ایک مرحوم بھی۔ لیکن کیا کہیئے کہ اتنا بڑا آرٹسٹ اب ہم میں موجود نہیں۔

[مرتب: غالب کی عظمت کا ایک پہلو اس رخ سے بھی ہے کہ ہند اسلامی تہذیب نے ہندوستان کو ایک تحفہ غالب کی شکل میں بھی دیا ہے:]

بالکل صحیح ہے۔ سر سید ہوتے، اردو ہوتی، تاج محل ہوا غالب ہوئے، یہ —— بعض مرئی بعض غیر مرئی! اور ہم آپ کیوں نہیں۔ یعنی کسی کو خاطر میں نہ لانے والے!

'شان جچتی نہ تھی آنکھوں میں جہاں داروں کی'

جو کہا ہے کہ شان نہ جچنا! مگر بر خود بھی غلط نہ ہونا!!

○

وہ بیدل کے کتنے ہی قائل کیوں نہ رہے ہوں مگر یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے:

"طرز بیدل بجز تفنن نیست"

اور یہ بھی ان کی بڑائی ہے کہ جیسی کاوا ک شاعری سے انھوں نے ابتدا کی تھی اور اس میں ایک عرصے مصروف رہے، اس سے بالکل مختلف قسم کی شاعری کے لئے انھیں اپنے آپ کو تیار کرنا پڑا —— اور بالآخر انھوں نے اپنے پیش روؤں سے کتنا ہی استفادہ کیوں نہ کیا ہو وہ بنیادی یا غیر منقطع طور پر غالب رہے۔

غالب سے پہلے روایت پرستی ہی کے سہارے بازار اور دربار میں مقبولیت ملتی تھی۔ اردو شاعروں کے سامنے فارسی شاعری کی اتنی روح نہیں تھی جتنی روایت۔ انھوں نے اردو غزل کی روایات سے پرہیز کیا۔ علیحدگی کا رجحان غالب میں معمول سے زیادہ بڑھا ہوا تھا، جینیس یوں بھی روش عام کے پابند نہیں ہوا کرتے،

فرسودہ رسمہائے عزیزاں فروگذار
در سور نوحہ خوان و بہ بزم عزا برقص

غالب اردو شاعری کی تنہا آواز ہے: انھوں نے اردو غزل کو نئی حیثیت، نئی قامت اور نیا لہجہ بخشا۔ ان سے اردو تاریخ شعر میں ایک نئے دھارے کا آغاز ہوتا ہے: غزل کا

فکری انداز! (یہ نہیں کہ جذبہ قطعاً مفقود ہو) عظیم غنائیہ شاعری میں جذبہ کی گرمی نہیں روشنی ملتی ہے!

○

غالب شاید اردو کے پہلے غزل گو ہیں جنھوں نے غمِ روزگار کی ترکیب استعمال کی ہے۔ لفظ 'خیال' تو انھوں نے جس کثرت سے استعمال کیا ہے اس کی مثال بھی دوسری جگہ کم ہے۔ اسی طرح آتش (اور اس کے سلسلے کے دوسرے الفاظ) آتش کدہ، سوزِ دروں وغیرہ۔

○

لفظوں کے استعمال کا جیسا شعور غالب کو ہے اتنا اور ایسا اردو کے کم شاعروں کے نصیب میں آیا۔ اردو کے روزمرّہ پر بھی انھیں ایسا ہی عبور ہے۔ اور یہاں روزمرّہ کو انھوں نے اپنا دست نگر رکھا ہے اس کے دست نگر کبھی نہیں ہوتے۔

پھر اتنے بے شمار احوالِ انسانی کی ترجمانی آپ کو کہیں اور نہیں ملے گی۔ شاید اسی لئے جس بے ساختگی اور کثرت سے ان کے اشعار معرضِ گفتار میں آتے ہیں، ان کے اور اقبال کے، ان کے بعد میر اور ان کے بعد بقیہ (اردو کے شاعر آتے ہیں)۔

یہ ان کی سادگی کے ساتھ پرکاری تھی جس نے انھیں اندازِ بیان اور بخشا۔

○

غالب کا جو اعتراف کیا جارہا ہے وہ تمام تر اُن کی اعلیٰ اردو شاعری کی بنا پر ہے۔ غالب کا مجموعۂ بیرنگ، ہی ہے جس پر ان کے شعر کی شہرت گیتی میں قائم ہے۔ اور کیا تعجب کہ آخر زمانے میں انھوں نے خود بھی یہ محسوس کر لیا ہو۔ جبھی تو کہتے ہیں:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

وہ اردو میں جتنے بے تکلف نظر آتے ہیں فارسی میں اتنے ہی باادب۔ اور ان کی فارسی میں وہ چاشنی نہیں آپاتی، بلکہ فارسی کے اہلِ زبان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ روزمرّہ اور محاورہ سے جابجا 'انحراف' ملتا ہے، تاہم ذوق و ذہن کی جو ترجمانی فارسی کلام میں ملتی ہے وہ ان کے اردو کلام میں نہیں، اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ غالب نے اگر اردو شاعری نہ کی ہوتی تو شاید ہم ان کی فارسی شاعری کی طرف اس احترام و عقیدت سے متوجہ نہ ہوتے۔

○

ان کے اردو خطوط کی اہمیت یقیناً اردو کلام سے کم اہم نہیں۔ خطوط نہ پکّا گانا ہونا چاہئے نہ فلمی گانا، نہ قوّالی۔ گفتگو کرنا، گفتگو کرنا ہی نہیں خاموش رہنے کا فن بھی ہے۔ اور خاموش رہنا صفاتِ الٰہیہ میں سے ایک صفت ہے۔ خطوط نویسی کو میں فنونِ لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں اور اردو میں یہ غالب ہی —— اشعار میں وہ کبھی کبھی ہم سے دور سے دور تر ہوتے جاتے ہیں لیکن خطوط میں نزدیک سے نزدیک تر!

○

(جہاں تک ان کی شخصیت کی تنقید کا تعلق ہے) ہم جس معیار سے کسی کی سیرت یا شخصیت کو پرکھنا چاہتے ہیں وہ فرشتے کی ہوتی ہے یا شیطان کی! حالانکہ انسان کی ترکیب میں یزداں اور اہرمن دونوں اپنا اپنا تناسب چاہتے ہیں!!

غالب طبقۂ زہّاد سے نہ تھے، رندانِ قدح خوار سے تھے۔ سوجھ بوجھ کے آدمی تھے، اپنے نفع ضرر کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں عقیدہ و عمل کی اس تپش و توانائی کی کمی تھی جو مذہب و ماورائیت کی ودیعت ہوتی ہے۔ دل کی آسودگی اقدارِ اعلیٰ سے حاصل ہوتی ہے؛ ان کے یہاں جو نا آسودگی نظر آتی ہے شاید وہ بھی اسی وجہ سے ہو!

●●

یوسف حسین خاں

(١٩)

وہ نقاد جو گرد و پیش کے حالات سے کسی ادیب یا فنکار کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں اس میں ایک حد تک صحت ضرور ہے، اس لئے کہ کوئی ادیب یا فن کار محض خلا میں اپنے فن کا اظہار نہیں کرتا ہے۔ لیکن اُسے بہت زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہیئے۔ اصل میں فنکار کا جوہر خود اس کے اندر ہوتا ہے۔

مثلاً غالب کی انفرادیت اس کے تمام ہم عصروں سے علیحدہ ہے۔ حالانکہ وہ سب ایک ہی گرد و پیش میں رہتے تھے، ایک قسم کے جاگیردارانہ ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ ایک ہی قسم کی زوال آمادہ سوسائٹی میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ سب میں یہ قدر مشترک تھی لیکن پھر بھی غالب میں ایک چونکا دینے والی بات ملتی ہے، جو دوسروں کے یہاں نہیں ہے۔ وہ کونسی چونکا دینے والی بات ہے جو اس کو علیحدہ کرتی ہے ذوق سے، مومن سے، ناسخ سے!

پہلی بات تو یہ ہوئی۔

غالب کی انفرادیت میں بعض ایسے عناصر ہیں، گھُل مل کے جن کا اظہار اس کی شاعری میں ہوا ہے۔ شروع سے امیرانہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی انھیں نصیب ہوئی۔ چچا نصراللہ بیگ، اور پھر نانا غلام حسین خاں کیموجرے، اس کے بعد جب وہ دہلی آئے تو اپنے سسر الٰہی بخش معروف اور ان کے بھائی احمد بخش کی وجہ سے یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی میں آنے جانے کا موقع ملا۔

دہلی آنے سے قبل انہوں نے اپنی شاعری شروع کردی تھی۔ اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی ذات میں ایک خاص اپچ شروع سے تھی، اور وہ اپنی ذات کو دوسرں سے نمایاں کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے محسوس کیا کہ بیدل کی پیروی ہی ایک ایسا ذریعہ ہے بجائے پٹے پٹائے راستے پر چلنے کے، یہ نیا راستہ اختیار کیا جائے۔ اور چونکہ ان کا تخیل بہت بلند تھا اس لئے بیدلؔ کے انداز میں اس کے اظہار کا اچھا موقع تھا۔ عام طور پر، اس زمانہ میں، روزمرّہ اور محاورے کی شاعری تھی، تخیل کی نہیں۔ غالبؔ نے بیدل کو اسی لئے چنا کہ وہ بلند تخیل کا شاعر ہے۔ لیکن چونکہ تجربے کی کمی تھی، ذہنی تربیت پوری نہیں ہو پائی تھی، اس لئے تخیل بے عناں ہو گیا؛ اور انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ زبان ایک معاشرتی وسیلہ ہے، اور اس کو معاشرے سے بے نیاز نہیں کیا جا سکتا!

چنانچہ ان کا جو ابتدائی کلام نسخۂ حمیدیہ میں ہے وہ اسی انداز کا ہے، اگرچہ بعض چیزیں الگ بھی ہیں لیکن ان میں بھی اس کی انفرادیت جلوہ گر ہے۔

دہلی آکر انھوں نے محسوس کیا کہ شاہی دربار میں ذوقؔ حاوی ہو چکے ہیں۔ اس زمانہ میں جب وہ آئے تو دیکھا ولیعہد ابوظفر کو سلیس زبان پسند ہے، اور جب وہ بادشاہ ہوئے تو انھوں نے اسی کی قدر افزائی بھی کی۔ ان کے احباب، خود ان کے خسر الٰہی بخش معروفؔ، آسان زبان لکھنے والوں میں تھے، یہ شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے۔

ان تمام اثرات سے انھوں نے سادگی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جو لب و لہجہ انھوں نے اپنے لئے مقرر کیا، وہ بھی خصوصیت رکھتا ہے۔ اُن کا لب و لہجہ میرؔ اور سوداؔ کا ملا جلا لب و لہجہ ہے۔ نہ میرؔ کی درماندگی ہے نہ سوداؔ کی گھن گرج ہے، بلند آہنگی ہے لیکن اس کے ساتھ مردانہ پن ہے؛ قوت ہے، تازگی ہے: غالبؔ کا لہجہ پہچانا جاتا ہے۔

اس لہجہ نے ان کے اسلوب کو متعین کیا: اسی وجہ سے انھیں مقبولیت بھی حاصل ہوئی تھی۔

غالبؔ کی شاعری میں جذبہ اور تخیل کا بڑا لطیف امتزاج ملتا ہے جس کی مثال ہمارے یہاں نہیں ہے اُن کی شاعری کا بہت بڑا حصہ عشقیہ شاعری پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اور تخیل کی گلکاریوں سے ان جذبات میں رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ لب و لہجہ کے علاوہ دوسری بڑی خصوصیت، غالب کی شاعری کی، ان کا بلند تخیل ہے جو اردو زبان میں اُس وقت تک کسی کے یہاں نہیں ملتا

(مرتب : اُسوقت تک یا اس وقت تک

یوسف حسین خاں: واقعہ یہ ہے کہ اِسوقت تک بھی! لیکن آپ اُس وقت ہی رکھیے) ایک طرح کی حرکت ہے، DYNAMISM ہے، جو اس زمانے کی سکونی اور سکوتی فضا میں ایک نئی چیز ہے۔

غالب کو مقبول بنانے میں ان کی انسان دوستی نے
بھی بڑی مدد دی، وہ بڑے وسیع مشرب انسان تھے اور
انسانی عظمت وفضیلت کو مانتے تھے۔ ان کے کلام میں
کافی اشعار ایسے ملتے ہیں جہاں انسان کی عظمت کا اظہار ہوتا
ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

GREATNESS OF MAN AS MAN ·
یہ بھی بالکل نئی چیز ہے؛ کسی شاعر کے یہاں یہ نہیں ملتا۔

یعنی محض انسان دوستی نہیں GREATNESS
جہاں تک ان کے کلام کی ہیئت کا تعلق ہے،
اس میں مصوری اور نغمگی بالکل ایک دوسرے سے شیروشکر
ہے، گھل مل گئی ہے۔ اور ان میں فضا نہ افسردگی نہیں پیدا ہوتی
بلکہ ایک طرح کی تازگی محسوس ہوتی ہے زندگی کی۔

ہمیں معلوم ہے غالب عمر بھر مصیبتوں کا شکار
رہے۔ لیکن ان کی ہنسی اور ٹھٹھول برابر جاری رہا؛ اور
انھوں نے، دراصل اپنی عملی زندگی میں، زندہ رہنے کا
سلیقہ اور قرینہ لوگوں کو بتلایا: مصیبت میں بھی
آدمی کیسے مسکرا سکتا ہے۔

ان کے کلام میں جو میں نے کہا، حرکت وتازگی
ہے جس کا اظہار ان کے بعض الفاظ کے بار بار استعمال
میں ملتا ہے، تمنا، شوق، اور — ان لفظوں کو وہ
بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں۔ اردو، فارسی دونوں
جگہ:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہ دراصل — اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں زندگی کے
امکانات کا علم تھا۔ اور اگرچہ وہ بعض اوقات ایک
جبری DETERMINIST نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت
میں وہ OPTIMIST ہیں جنہیں گھٹاٹوپ اندھیرے
میں بھی زندگی کی کرن جھانکتی نظر آتی ہے۔ اور زندگی
سے انھوں نے اپنی توقعات کو کبھی ختم نہیں کیا۔ دائمی
آرزومندی ان کا مستقل موضوع ہے اردو، فارسی
دونوں جگہ اس کی مثالیں مل جائیں گی۔ اور یہ، — اس
طریقے سے کہہ سکتے ہیں کہ، اس اعتبار سے، وہ اقبال
کے پیشرو ہیں۔ (مرتب: — گلستاں مجھ سے)

یوسف حسین خاں: جی ہاں، وہ غزل "مجھ سے"، یہ غزل
انسان کی عظمت کا ترانہ ہے۔ فارسی میں بھی ایسی پوری،
پوری غزلیں ملتی ہیں۔ اے بھلا دہلا الخ؛ یا منم والی
غزل پوری، انسانی عظمت پر ہے: میں یہ ہوں! میں یہ
ہوں!! میں یہ ہوں!!! ایک "تجھ سے" بھی ہے، ایک
جگہ اپنی شخصیت کا ادعا ہے، دوسری جگہ باری تعالیٰ کا بھی
— جسے بعد میں اقبال نے کہا:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان وکہسار وراغ آفریدی
خیابان وگلزار وباغ آفریدم

اقبال کی جوان پر نظم ہے، جس میں ان کے تخیل کو سراہا گیا
ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑے شاعر تھے، اور
انھوں نے غالب کی عظمت کو ان کے تخیل میں محسوس کیا!
جب تخیل اور جذبہ دونوں مل جائیں تو بے پناہ قوت
اس میں آجاتی ہے۔ غالب کی عظمت اسی میں ہے کہ اس
نے تخیل اور جذبہ دونوں کو ملا کر اپنا رنگ جمایا۔ اس کے
لئے ایک خاص ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ان

کا جو ابتدائی کلام ہے تخیل بلند ہے جذبہ کی کمی ہے؛ اس لئے وہ بے مزہ ہے۔ لیکن بعد میں، زندگی کے تجربہ کے بعد جب دونوں مل گئے ہیں تو تاثیر بے پناہ ہو گئی ہے

وہ جو ہم ان کی مشکل پسندی کہتے ہیں تو وہ خالص تخیل کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں ایک طرح کا اشکال اُن کی آسان غزلوں میں بھی ہے۔ اُن کا سہل ممتنع دوسروں کے کلام سے بالکل الگ ہے۔ ان میں بھی ایک طرح کا رمزی اور طلسمی اشکال ہے۔

غالب کی شاعری میں جب ہیئت سے بحث کی جائے تو اس میں ایک چیز اور قابلِ لحاظ ہے کہ:

عام طور سے ان کے ہمعصر تشبیہ و تمثیل سے آگے نہیں بڑھے، غالب نے استعارہ اور استعارہ بالکنایہ کو بڑی خوبی سے برتا جس سے اُن کے کلام کو اور چار چاند لگ گئے۔ ورنہ، ان کے ہمعصروں کے یہاں یہ اتنا نہیں ملتا۔

یہ ہیئت کی بات ہوئی، شعر کا تو مجموعی اثر ہوتا ہے نا! تخیل ہے، جذبہ ہے، پھر اظہار کی ہیئت ہے۔ سب مجموعی اثر ہے۔ کلام کی تاثیر دراصل مجموعی اثرات سے پیدا ہوتی ہے۔ جس میں ہیئت بھی شامل ہے، مفہوم بھی شامل ہے۔

اُس کی شاعری کا مجموعی اثر جو ہے وہ یقیناً ایک عظیم شاعر کا ہی ہو سکتا ہے۔ عظمت ABSOLUTE معنی میں نہیں۔ لیکن اردو کو تو یقیناً اقبال اور غالب دو ہی بڑے شاعر ہیں؛ میر صاحب بھی ہیں لیکن۔ باقی تو اور تو کسی کو میں مانتا نہیں۔ اردو زبان کے بہت بڑے شاعر ہیں یہ دونوں دونوں میں ایک مناسبت بھی ہے: اقبال نے اپنے تخیل کو ایک خاص نہج پر ڈھالا ہے۔ یہ عشق و محبت میں پہنچے رہے ایک چیز ان میں مشترک ہے: حرکی عنصر اور انسان کی فضیلت:

چند شعر جو مجھے پسند ہیں اور جن سے مذکورہ تجزیہ پر روشنی پڑتی ہے۔):

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا، نہ مانگ

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

خواجہ احمد عباس

(۲۲)

یہ صحیح ہے کہ اس کی عظمت کی بنیاد اس کا اردو کلام ہی ہے لیکن غالب کی شہرت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اس کلام کا ایک بڑا حصّہ نظری کر دیا اور صرف انتخاب سامنے لائے۔ وہ اپنے شاگردوں وغیرہ پر بھی سختی سے تنقید کرتے تھے؛ اور اپنے کلام پر تنقید کرنے میں بھی، باوجود اپنے ان تمام دعاوی کے کہ یہ ایسا ہے اور ویسا ہے، اور شراب کہنہ ہو کے اس کی قدر ہوگی ـــــ باوجود اس کے انھوں نے اپنے کلام پر تنقید کی اور جن اشعار کو اچھا سمجھا انھیں رکھا، اگرچہ بعد میں تحقیق کرنے والوں نے اُسے ڈھونڈھ نکالا اور شائع کیا۔

آج کل کے شاعروں کو آپ دیکھئے ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ جو کچھ بھی اس نے کہا ہے وہ شائع ہو جائے تاکہ غیر فانی بن جائے۔ غالب نے اپنے اس کلام کو بھی نظری کر دیا تھا جس میں بہت اچھے شعر مل جاتے ہیں۔ تو ایک بات تو یہ ہے کہ کُل ان کا اردو کلام ہمارے بہت سے اردو شاعروں سے سائز کے لحاظ سے کم ہے شروع میں جو دیوان چھپا مثلاً ذاکر صاحب کا کاویانی پریس والا ایڈیشن، اس میں کل سو صفحے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے ان کی عظمت کی اور ان کی اہمیت کی، کہ جتنا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے انسانوں کے جذبات کا، ان کے خیالات کا، جو اُن کے بنیادی مسائل ہیں ان کا، اور جو انھوں نے اظہار کیا، اتنا دوسروں کے یہاں نہیں ملتا ـــــ ان کی شاعری میں ہمیں ـــــ یہ نہیں ملتا کہ ان کے زمانے میں جو چیزیں ہو رہی تھیں ان کے بارے میں ـــــ ۱۸۴۰ء میں ہندستان میں کیا ہو رہا تھا، ۱۸۵۰ء میں کیا ہو رہا تھا، ۱۸۶۰ء میں کیا ہو رہا تھا؛ تو آج کل کے نئے شاعر جو ہیں جو چاہتے ہیں کہ جو کچھ حالات ہو رہے ہیں انھیں کو REFLECT کریں، غالب نے اس کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ جو بنیادی PASSIONS ہیں، اور جو انسانوں کے مسائل ہیں؛ آج بھی ہیں، کل بھی رہیں گے اور سو سال کے بعد بھی، ان کے کلام میں آپ ـــــ وقت کے اور عارضی مسائل پر اظہار

سے فوری اثر تو ہوتا ہے مگر جب زمانہ گزر جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ——— تو اچھا یہی ہے کہ جو FUNDAMENTAL جذبات ہیں ان پر لکھا جائے۔

پھر PROFANE DISAGRED LOVE کی بات کہی جاتی ہے، غالب کے یہاں دونوں ہی ہیں: وہ انسان کے اور خدا کے تعلقات سے بھی بحث کرتے ہیں؛ اور خدا کو چھوڑ کے انسان کے مسائل بھی ان کے یہاں مل جاتے ہیں: عزت نفس کا جو سوال ہے، اس کے اندر جو کشمکش رہتی ہے اعلیٰ جذبات اور نیچے جذبات ہیں، اس سب کی وجہ سے وہ جلدی سے DATE ہونے والے شاعر ہیں۔

خیر، بعض لوگ فیشن میں بھی غالب کو پسند کرتے ہیں اسکی غزلیں پڑھتے ہیں۔ فلم جو بن گئی اس کی وجہ سے بھی لوگ غالب کی غزلیں گانے لگے۔

غالب کی باضابطہ تعلیم تو بہت مختصر ہوئی تھی، مگر فلسفیانہ سوچنے والا، اور طباع ذہن تھا، طبیعت میں شگفتگی اور ظرافت تھی؛ اور حالانکہ زمانے نے بہت تنگ کیا، اور ان کے اندر یہ کشمکش رہتی تھی کہ: شاعری میں تو وہ مقام تھا، اور خاندان کا بھی ایک مقام تھا؛ ایک طرف یہ تھا، دوسری طرف کھانے کیلئے، پینے کے لئے، شراب کے لئے ضروری اسباب نہیں ملتے تھے؛ یہاں تک کہ پنشن بھی ۳-۴ سال تک بند رہی؛ تو، یہ ایک زبردست CONFLICT بھی تھی جو آخر عمر میں ان پر مستقلاً طاری تھی؛ اور کچھ میرے خیال سے، اپنے زورِ بیان کی وجہ سے طاری کرلی تھی۔ ورنہ ان کی ظرافت اور اپج قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اپنے اشعار میں بھی اور قطعوں میں بھی انھوں نے اس بات کا گلہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ بیس سال سے شاعری چھوڑ دی ہے اور ——— لیکن ان کی بہت اعلیٰ درجے کی اردو شاعری بعد ہی کے زمانے کی کی ہوئی ہے جس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے اصرار پر میں اشعار لکھ لے جاتا ہوں؛ مگر ان کے اس میں پختگی ہے، روانی ہے، سلاست ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے جیسے نیا راستہ انھوں نے تلاش کیا ہو۔ ابتداءً تو بیدل وغیرہ کا اثر کام کرتا رہا؛ اور اگرچہ وہ کہتے تھے قبول عام سے غرض نہیں ہے، لیکن ہر شاعر کو اس کی آرزو ہوتی ہے۔ تو وہی غالب جن کے یہاں آپ شروع میں اردو اور فارسی میں تمیز نہیں کر سکتے وہ ایسے شعر کہنے لگتے ہیں کہ، گاندھی جی کی ہندوستانی تو مصنوعی ہندستانی تھی، وہ اصلی ہندستانی زبان کا نمونہ پیش کر دیتے ہیں:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ؎ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

تو ایک تو زبان کو انھوں نے کوشش کر کے مقبول عام بنایا، اور پھر جب یہ محسوس کیا کہ اپنے خیالات کو اس زبان میں ادا نہیں کرسکتے، تو زبان کے نئے سانچے بنائے؛ اس کے لئے فارسی سے بھی تشبیہیں اور استعارے لئے، اور پھر خود اپنی نئی ترکیبیں بنائیں، استعارے بنائے؛ بعض دفعہ لفظوں کو نئے معنی میں نئے CONTEXT میں بنایا۔ اور اس طرح اردو زبان کو نئی وسعت بخشی۔ یہ سب وہی کرسکتا ہے جسے زبان پر پوری قدرت ہو۔

غالب کی اگرچہ باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی، مگر پرانے DISCIPLINES میں فلسفہ، اخلاقیات، یہاں تک کہ نجوم وغیرہ بھی ——— اور اس کا اثر بھی پایا جاتا ہے۔

ایک اور چیز بھی ہے جو ان کے کلام کو اہم بناتی ہے: وہ ایک اچھے اور گہرے معنوں میں HUMANIST تھے۔ ان کی کوئی چیز پڑھیے، کہیں تعصب اور تنگ نظری نہیں ملتی؛ حالانکہ SOCIAL POINT OF VIEW سے جس سوسائٹی میں وہ پلے بڑھے وہ بورژوا سوسائٹی تھی، طبقات کی سوسائٹی۔ مگر جب وہ شاعری کے (میدان) میں آتے ہیں تو یہاں آپ

طبقوں کا REFLECTION نہیں دیکھ سکتے۔

وہ لوگ جنھوں نے انسانیت کے فلسفہ کی تفسیر کی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں خدا کا CONCEPTION نہیں ہے بالکل۔ لیکن دوسرے ہیں جنھوں نے اس فلسفہ کا مرکز یہ سمجھا ہے کہ انسان کو بہت بڑی اہمیت دیں گے، اور یہ نہیں کہ وہ NATURAL اور SUPERNATURAL FORCES کے لئے ایک کھلونا ہے، بلکہ یہ کہ خود اپنی تقدیر کو بنانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ تو یہ چیز ان کے یہاں پائی جاتی ہے۔ انسان کو جو عظمت ہے اس کا ان کو احساس تھا۔ اور، اگرچہ ہر شاعر یہ کرتا ہے کہ مختلف اوقات میں جو کیفیتیں گذرتی ہیں وہ انھیں ظاہر کرتا ہے؛ تو CONSISTENCY ان کے یہاں نہیں ملے گی۔ کہیں تو تقدیر کی بندشیں توڑنے کی بات کرتے ہیں، کہیں (بالکل مجبور نظر آتے ہیں) تو THESE ARE DIFFERENT MOODS تو، کوئی بھی شاعر ہے اسے ہمیں AS A WHOLE اندازہ کرنا ہوگا کہ قنوطی ہے رجائیت پسند ہے، ———— اور پھر یہ بھی کہ انسان کی زندگی محض یہی سامنے کی زندگی ہے یا اس میں امکانات ہیں جو سوئے ہوتے ہیں؟ تو غالب اس دوسری CATEGORY کے اندر آتے ہیں، A HUMANIST WHO BELIEVES IN ACTIVE ROLE OF MAN

پھر اس کے برخلاف؛ شاعر اپنی کیفیات اور اپنے جذبات کو ہی نہیں، بلکہ جو دوسروں پر گزرتی ہے اسے بھی ظاہر کرتا ہے (غالب کے یہاں ان دونوں چیزوں میں فرق کرنا چاہیئے)

○

زبان کے اعتبار سے بھی شاگردوں کو یہ بتاتے تھے کہ اپنے کلام میں جو زبان استعمال کرتے ہو اس کو دیکھنا چاہتے ہو کہ سنگ ہے یا نہیں ہے تو پرانے اساتذہ کا مطالعہ کرو لیکن، ان کی بھی غلامی مت کرو۔ کہیں لکھا ہے کہ یہ شعر اگر...... کا بھی ہوتا تو میں اُسے مسترد کر دیتا۔ یا کسی کے بارے میں یہ کہ وہ تو ایک آدمی ہی تھا، تمھارے اوپر فرض نہیں ہے کہ کتنا ہی بڑا اُستاد ہو اس کی غلطی کی بھی پیروی کرو؛ جمہور کی ہر معنی میں پیروی کرنا صحیح نہیں ہے۔ ایک جگہ شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی سے عبارت ہے، اس لئے محض قافیہ پیمائی میں کمال سے بڑا شاعر نہیں بن سکتا جب تک معنی آفرینی نہ ہو؛ یعنی زندگی کے اندر جو بھی ہے؛ انسانی زندگی ہے، کائنات کی زندگی ہے، مظاہر فطرت ہیں، ان سب کو اگر ظاہر کر سکتا ہے تو وہ حق ادا کرتا ہے ورنہ الفاظ کی بازی گری تو ———— ایک زمانہ میں انھوں نے خود بھی ایسا کیا، مگر جب پختگی آگئی تو اس بات پر زور دیا۔

○

غالب کو دوسرے شعراء سے ٹکرانا اچھی بات نہیں، ضروری بھی نہیں۔ مختلف شعراء جو ہیں انھوں نے اپنے لئے ایک خاص میدان چنا؛ حالی کا میدان جو ہے وہ زیادہ تر اقبال سے الگ ہے۔ میر اور غالب میں بعض چیزیں مشترک ضرور ہیں، لیکن ———— تو ہمیں تو سب کو دل سے لگانا چاہئے، کوئی ضروری نہیں کہ ہم انیسیے بن جائیں یا دبیریے! تو میں CLASSIFICATION کا قائل نہیں ہوں۔ میں تو اصحاب ثلاثہ و پنجتن کی لڑائی بھی پسند نہیں کرتا۔ تو، جو آفاقی نظر ہے ہماری، شاعری کی، اس پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہئے۔

○

(مرتب: غالب کی عظمت میں اُردو شاعری کے علاوہ اس کے خطوط کو یا اس کی مجموعی شخصیت کو بھی کچھ دخل ہے!) میرے خیال میں خطوط کا خاص طور پہ اثر ہے۔ اور شخصیت بھی تو عجیب ہے۔!

ع اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

جو شخص اپنی مجبوری سے تنگ آ کر کیا کیا لکھے۔ پھر یہ بھی کہ میں تو بھاٹ تھا بھٹئی کرتا تھا، اب پنشن موقوف تو بھٹئی بھی موقوف! دلی کالج کی نوکری والا واقعہ بھی پڑھا ہوگا آپ نے۔۔۔۔ چنانچہ انھوں نے انکار کر دیا۔ اسی طرح اودھ گئے تھے تو دو شرطیں دربار کے لئے رکھی تھیں، ایک یہ کہ CEREMONIOSLY RECIEVE کیا جائے؛ دوسرے نذر نہیں دوں گا۔ یہ ہوا نہیں تو ملے بغیر کلکتہ چلے گئے۔ ہمارے یہاں بڑے بڑے پروفیسر انٹرویو میں جاتے ہیں کسی نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔۔۔۔ مگر ان میں تھی ایک آن بان!

پھر لوگ چھپ چھپ کے جو کام کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں مگر کبھی اقرار نہیں کرتے، انھوں نے ہر جگہ بے دھڑک اس کا اعلان کیا۔

اور میرے اوپر تو اس واقعہ نے بہت اثر کیا ہے جو حالی نے لکھا ہے کہ: اس زمانے میں غالب پریشان تھے، قاطع برہان کے قضیے کے سلسلہ میں خطوط وغیرہ بھی آتے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں حالی نے کچھ اُن سے یہ کہہ دیا کہ نماز نہیں پڑھتے آپ۔ اس پر انھوں نے حالی کو جواب دیا تھا کہ میں تو واقعی ایسا گنہگار ہوں کہ منھ کالا کر کے اور شہر میں تشہیر کی جائے۔ حالی نے فوراً ندامت کا قطعہ لکھا جس پر پھر غالب نے لکھا؛ پھر حالی نے اس کا جواب لکھا۔ اس پر غالب نے وہ مشہور قطعہ لکھا کہ اگر خدا مجھے دوسری زندگی دے تو اس میں صرف دو چیزیں اس سے مانگوں: ایک پچھلی زندگی میں جو عبادتیں قضا کی ہیں ان کی تلافی، دوسرے حالی کی بارگاہ میں معذرت! حالی نے پھر کچھ لکھا تو غالب نے یہ لکھ کر اس سلسلہ کو ختم کر دیا کہ بخشا بخشی موقوف۔!

واقعتاً اُس میں ایک شان تھی؛ ایک خوداعتمادی تھی۔

AND HE DID NOT HAVE DAMN OPINION!

دوسری طرف وہ بڑے سادہ، بہت محبت کے اور اخلاق کے آدمی تھے۔ ہندو دوست تھے بہت سے ان کے۔ بلکہ غدر کے زمانے میں تو مسلمان لوگ بھاگ گئے تھے ادھر اُدھر تو انھوں نے ہی غالب کی دیکھ بھال رکھی۔ اور جب کھانے کو کچھ نہیں تھا اپنے پاس تب بھی عزیزوں کی مدد کرتے رہے، ان کے خرچ کسی نہ کسی طرح اٹھاتے رہے۔ اسی غدر کے زمانے میں اُن کے بھائی کا انتقال ہوا، ان کو کس کس طرح ۔۔۔۔ تو انسانی خوبیاں بھی تھیں ان میں، ظرافت، اور شگفتگی بھی تھی، گفتگو کرنے کا فن بھی تھا، اور اعلیٰ درجے کی شعر گوئی کی صلاحیت بھی تھی۔

(مرتب، عالمی سطح پر غالب کی عظمت کے بارے میں ۔۔۔)

اس کا اندازہ اس وقت ہو سکے گا کہ جو ترجمے ہو رہے ہیں وہ شائع ہو جائیں، ان کا IMPACT دیکھا جائے۔ شاعری تو ایسی ہے غالب کی کہ ترجمہ آسان نہیں ہے۔ اگر شاعری ایسی ہو جس میں THOUGHT CONTENT پر زور ہو تو نسبتاً آسانی رہتی ہے، مثلاً اقبال کی شاعری۔ غالب کے یہاں یہ ہے کہ جذبات کی شاعری ہے۔ بہت سی چیزیں جو آپ فوراً سمجھ لیتے ہیں فرنچ اور جرمن میں ترجمہ ہو کے آپ کے سامنے آئیں تو آپ خود سوچیں گے کہ ۔۔۔۔ اب اس کا شعر ہے:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس کا ترجمہ زبان کا ترجمہ کوئی کرے تو کیا کرے گا۔

WHAT ...... FOOLISH HEART
WHAT IS REMEDY WITH THIS DISEAS

لیکن جو روایات زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ

ASSOCIATIONS قائم ہو جاتے ہیں؛ اور وہ جب غالب کو اُردو یا فارسی میں پڑھتے ہیں، فوراً ان کا ذہن ادھر منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ بات دوسری زبانوں میں تو مشکل ہو گی جن کے CULTURAL قطعی مختلف ہیں۔

مثلاً بزم کا لفظ لیجئے: ایک تو روم کے مقابلے میں ہے
CIVILISED GATHERING
یا CROWD OF PEACE، دوسرے معشوق وہاں بیٹھا ہوگا، شمع جلتی ہوگی، شعر و شاعری کا دور چلتا ہوگا، صاحبانِ ذوق جمع ہوں گے۔ اس میں یہ سب چیزیں ہیں، یہ ان سب کو معلوم ہے جو اُردو فارسی شاعری کو جانتے ہیں۔ اب اُسے انگلش یا فرنچ میں ترجمہ کریں، تو وہاں وہ IDEA ہی نہیں!

تو WORLD IMAGE کا اندازہ ابھی مشکل ہے جب تک یہ نہ ہو لے کہ کس QUALITY کے ترجمے یا INTERPRETATION سامنے آ رہے ہیں۔ بعض جگہ TEAMS کام کر رہی ہیں (ہندستانی اور یورپی نمائندے) اس طرح مل کر کامیابی ہو سکتی ہے؛ لیکن بہرحال مترجمین کے ذہن میں تو اوپر کے لوگ ہوں گے معمولی پڑھنے والوں کے لئے وہ کیا بنیادیں دیںگے!

○

غالب کی زندگی پر بھی اور شاعری کے APPRAISAL کے بارے میں بھی حالی کے بعد حالی سے ہٹ کر زیادہ چیزیں سامنے نہیں آئیں، یوں بھی غالب کی سی UNEVENTFUL LIFE پر بہت زیادہ تو ہو بھی نہیں سکتا۔ ہی دو چار چیزیں ہیں ان کی زندگی میں؛ پنشن کا قصہ، سفر کلکتہ، قاطع برہان کا قصہ، یا پھر غدر جو ان کی زندگی کا واقعہ اتنا نہیں ہے جتنا یہ کہ وہ ان کے زمانے میں ہوا۔

HIS REAL LIFE WAS INNER
LIFE جو ایک MINT تھی۔ خارجی زندگی کا اثر پڑتا ضرور ہے لیکن ——

○

معنی خوب خوب نکالتا ہے وہ، جو عام لکھنے والے کے ذہن میں نہیں آ پاتے:

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

اس کی شکایت ہی کیا اگر تم صحرا میں ہو۔ اصل تمہارا فن تو جلنا ہے، گر نہیں خانۂ لیلیٰ نہ سہی، زیادہ وسیع پیمانے پر صحرا کو روشن کر رہے ہو۔ یا:

درماندگی میں غالب! کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

جس کا دوسرا رُخ کسی نئے شاعر نے یوں پیش کیا ہے:

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

○

جنت کے سلسلہ میں اس کے یہاں مجھے پانچ چھ شعر ملے ہیں اس میں مجھے تو ایک UNITY نظر آتی ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

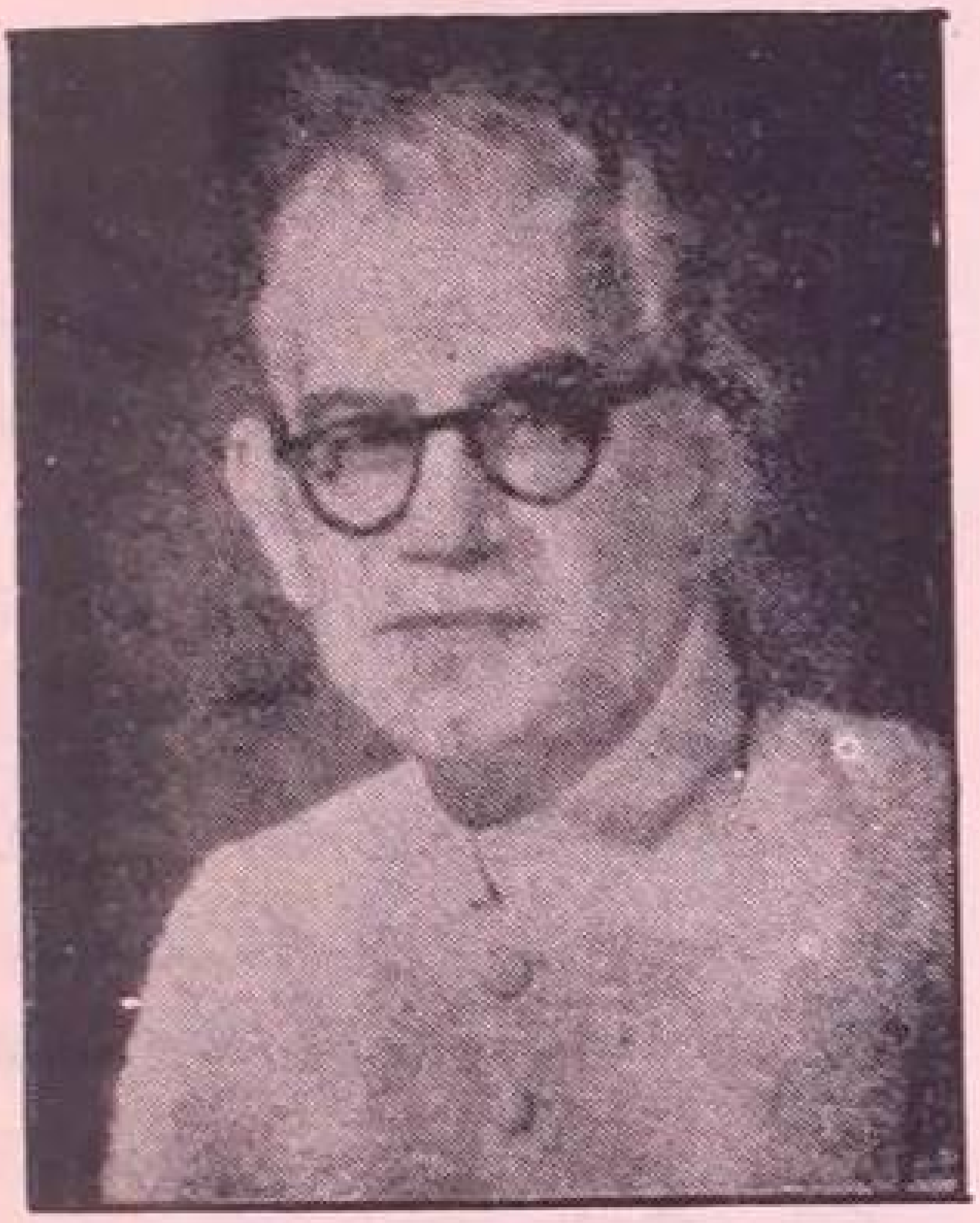
اور دوسرے شعر۔

اسی میں جب وہ کہتا ہے،

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں جب تک وہ خدا کی جلوہ گاہ نہ ہو۔ — تری جلوہ گاہ ہو، اس میں تری کا EMPHASIS اہم ہے۔

▲ ▲



آنند نرائن ملا

۴۰

(غالب پر اتنے بہت سے فاضلوں کی بحث کے بعد بھی) مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ:

فسانہ ختم ہوا، داستان باقی ہے

دراصل عظیم فن کار پہاڑ کی کوئی ایک چوٹی نہیں ہوتا کہ ہم کہہ سکیں کہ یہ ہے اس کی بلندی۔ وہ تو ایک سلسلۂ کوہ ہوتا ہے، ہمالیہ کی مانند، جو کسی ایک چوٹی کا نام نہیں بلکہ کتنی ہی چوٹیوں کا ایک سلسلہ ہے۔

آج اگر دنیا یہ خواب دیکھ رہی ہے کہ COMMON WEALTH OF HUMANITY کو ترتیب دیا جائے تو ایسے ہی دانشور اس کے رہبر ہوں گے۔

(غالب کی عظمت کا جہاں تک تعلق ہے) وہ حسن جو انسانی نظر نہیں دیکھ سکتی اور خوردبین کے ذریعے دیکھا جائے میری رائے میں وہ حسن کہلانے کا مستحق نہیں یہاں بھی غالب کو بہت سی خوردبینوں سے دیکھا گیا ہے۔ مگر میرے نزدیک غالب کے لئے صرف دو باتیں کافی ہیں:

ایک تو یہ کہ آج ہم غالب صدی یہاں کیوں منا رہے ہیں؟ اور کسی اور شاعر کے لئے ہم نے اس قسم کا جشن کیوں نہیں کیا؟ اسی سے ہمیں معلوم ہونے لگے گا کہ وہ کیا خصوصیات ہیں، جو اسے علیحدہ کرتی ہیں اپنے دور کے پیشرو شاعروں سے!

دوسرے یہ، کہ اوروں کی بابت تو (خیر جو کچھ ہو) میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ غالب اور اقبال میری نظر کے سامنے نہ آتے تو میں اردو کا شاعر نہ ہوتا، شاید انگریزی زبان میں تیسرے درجہ کی شاعری کرتا ہوتا! تو یہ کہنا کہ غالب نے اثر نہیں ڈالا اس دور کے ادب پر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس نے ہم کو راہیں دیں، موڑ دیا۔ دراصل بڑا فن کار ایک فرد نہیں ہوتا، ایک موڑ ہوتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کے پچاس ساٹھ نام لے لیجئے اور خالی ان سے معلوم ہو جائے گا کہ روز آفرینش سے آج تک دنیا —— اسی طرح ادب میں بھی دس بارہ نام —— اس واسطے غالب کو یہ کہنا کہ ان کے معاصرین کے یہاں بھی یہ چیزیں مل جاتی ہیں (جو غالب کے یہاں ہیں) کچھ غور طلب امر ہے خاص طور پر اس لئے کہ غزل میں روایتی شاعری بھی ہوتی ہے اور —— تو بڑی نظر کی ضرورت ہے کہ کہاں تک روایت ہے اور کہاں انفرادیت! اور یہی چیز ہے درجہ دلانے کے لئے۔

اور غالب کے یہاں آپ کو جو CONTRADICTIONS ملیں ان کے لئے آپ کو طے کرنا ہوگا کہ غالب کی زندگی، غالب کا نظریہ، دیکھتے ہوئے کون سا رویّہ غالب سے ہم آہنگ ہے اور کون سا روایتی! جس وقت کہ متضاد بیان سامنے آئیں اس وقت اس شاعر کی زندگی پر غور کیجئے؛ اور تب یہ طے کیجئے کہ کون اس کے دل کی آواز ہے اور کون سی روایت کی! وہ BUZZLING IRREPRESSABLE HUMANITY جو کسی دوسرے کلام میں نہیں، (وہ ہے اس کا سب سے حاوی رنگ)۔

ہم غالب کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے ہمارے اپنے دور کی قدریں ہوتی ہیں، ہمارے سپنے خواب ہوتے ہیں، اور ہمارے اپنے نظریے ہوتے ہیں۔ اور جب ہم اسے ان کے ساتھ ہم آہنگ پاتے ہیں تو ان رشتوں کی وجہ سے اس کی قدر کرتے ہیں۔ تو، اگر غالب کی قدریں زندہ نہ ہوتیں تو آج یہ دن وہ نہ دیکھ پاتے! ابھی ان کا ایک شعر پڑھا گیا تھا:

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اب اس شعر کو لیجئے اور آج فیض کا قطعہ پڑھیے، اسی کی آواز بازگشت ہے یا نہیں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

دوسری مثال داخلیت میں بھی دیکھ لیجے۔ غالب کا شعر ہے


گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اور آج فراق کیا کہہ رہے ہیں:

مدّتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

کیا یہ آواز بازگشت نہیں ہے؟

تو اگر ہم غالب کی راہ پر چل رہے ہیں تو وہ رشتے قائم ہیں۔ اور جب تک ہم (ان قدروں کو جانتے اور مانتے رہیں گے) اس وقت تک غالب ضرور زندہ رہیں گے۔



(۲۱)

مجھے تو کچھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے صحیح کہا تھا کہ:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غالب پر جب گفتگو ہوگی تو ہر ایک یہ محسوس کرے گا کہ غالب کی تمام خصوصیات کا احاطہ کرنا اور انکی عظمت کا ایک بہت واضح نقشہ پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن ہر ایک کے دل میں کم از کم آج جو بیدار ذہن کے لوگ ہیں، اور جو باشعور لوگ ہیں اور جو فن کا اور نیکی کا، اور ادب کا تصور رکھتے ہیں، وہ یہ محسوس کرتے

ہیں کہ غالب کی عظمت روز بروز زیادہ واضح ہوتی جاتی تو اس لحاظ سے یہ جو کہا گیا، ٹھیک کہا گیا کہ ممکن ہے بعض اقدار یا بعض پہلوؤں میں میر بڑے نظر آئیں، یا بعض پہلوؤں میں ممکن ہے اقبال بڑے نظر آئیں؛ بعض پہلوؤں میں انیس بڑے نظر آئیں، نظیر بڑے نظر آئیں۔ لیکن جب ہم مجموعی تصور لیں گے تو مجموعی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ غالب کی عظمت جو ہے وہ اس بات میں ہے کہ انہوں نے اس شاعری کو جو زیادہ تر جذبات، اور جذبات میں بھی خاص طور پر ایک خاص قسم کے انفعالی جذبات کی آئینہ دار تھی، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اور پہلو نہیں تھے۔ مگر زیادہ تر تھی، اس کو اپنے دور کے اس شعور کا آئینہ دار بنایا جو کہ اپنے دور کی پیچیدگی سے واقف تھا، پیچ و خم سے واقف تھا! اور اسکے ساتھ ساتھ وہ اسکو اس زبان میں ڈھال سکتا تھا جو کہ ہر لفظ کو گنجینۂ معنی بنا دیتی ہے، شاعری کو نہیں بلکہ ہر لفظ کو! اور اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ کہا گیا، معنی کی تہیں ہوتی ہیں؛ اور یہ تہیں جو ہیں یہ ہمکو برابر متاثر کرتی رہتی ہیں۔ اور ان کے چراغ سے ہم اور چراغ جلا سکتے ہیں۔ تو یہ جو غالب کا، وژن ہے، یا یہ غالب کی نظر ہے، اور اس نظر کے لئے جو فن انہوں نے پیش کیا ہے وہ فن اپنی جگہ پر خاص طور پر میرے خیال میں ظاہر ہوتا ہے استعارے سے۔ اور استعارہ جیسا کہ میں نے کہا آرائشی معنوں میں نہیں، یا محض مشابہت دکھانے کے لئے نہیں، یا محض ایک تصویر لانے کے لئے نہیں، بلکہ یوں سمجھے کہ بہت بڑے دفتر کو ایک ایسے اشارے کے ذریعے بیان کرتے ہیں، جس سے کہ برابر معنی کی تہیں بیدار ہو سکیں۔

تو اس لئے، میرا خیال یہ ہے کہ غالب کی عظمت کا جو اعتراف ہے وہ روز بروز ہوتا جا رہا ہے؛ اور ہو سکتا ہے کہ جس طرح سے خلیفہ عبدالحکیم نے افکار غالب میں موجودہ دور کے بہت سے افکار غالب کے اشعار سے ثابت کئے ہیں؛ اس کو آپ چاہیں تو طفلانہ کوشش بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسے کہ بجنوری کی کوششوں کو بعض لوگ کہتے ہیں۔ لیکن، میرا خیال یہ ہے کہ تسکین جو ملتی ہے وہ اس لئے ملتی ہے کہ وہ حقیقتیں جو مجمل طور پر غالب نے بیان کی تھیں اور زیادہ واضح ہوتی جاتی ہیں۔

مثلاً: میں کہہ سکتا ہوں کہ آج جتنے مسائل ہیں ان کو آپ چاہے تو غالب کے کسی نہ کسی شعر سے پیش کر سکتے ہیں اور اس میں تسکین ملتی ہے۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

بتائیے!

یا: عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

یہ ہے عشقیہ شاعری کا شعر مگر بڑی عشقیہ شاعری کا ہے۔ جو زندگی کے بہت سے پہلوؤں کا بھی احاطہ کر سکتا ہے۔ تو اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ یہ غالب کی عظمت اب مسلم ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس دور میں، خاص طور پر، چونکہ لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کا آئیڈیل (IDEAL) اپنی جگہ پر صحیح، لیکن پہلے آدمی کو سمجھ لو۔ تو آدمی کو، اور زندگی جس طرح آدمی کرتا ہے، اور جو اس کے پیچ و خم ہوتے ہیں، اس کو سمجھنے میں غالب مدد دیتا ہے اور غالب کے راستے آئندہ اردو شاعری آگے بڑھے گی۔ اور زندگی کی زیادہ بصیرت حاصل ہوگی۔



فراق گورکھپوری

۴۳

میں دو چار باتیں بالکل منتشر طور سے عرض کر دوں۔

مجھے اس سے بالکل اتفاق ہے کہ کسی فنکار کی عظمت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے اخلاق بلند ہوں۔ شاعری جو ہے وہ ایک فنِ لطیف ہے جس طرح سے کہ ایک مصوّر ہے جس طرح سے کہ ایک بت تراش ہے، جس طرح سے کہ ایک گانے والا ہے، اسی طریقے سے ایک شاعر ہے۔ اگر ہم ایک گانے والے سے، اور ایک بُت بنانے والے سے اور ایک تصویر بنانے والے سے یہ توقع نہیں رکھتے ہیں کہ اس کے اخلاق بہت بلند ہوں تو شعر کہنے والوں سے ہم اس کی توقع کیوں رکھیں۔ کم از کم یہ میرا خیال ہے۔

اچھا۔ اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں ——— شعراء کے حالاتِ زندگی سے، خواہ اس ملک کے ہوں یا دوسرے ممالک کے، تھوڑی بہت واقفیت میری ہے ——— تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ایسا کہتے ہیں ان کی واقفیت بہت ہی محدود ہے۔ شیکسپیر کا آپ نے ذکر فرمایا تھا۔ اس کے متعلق عام طور سے مشہور ہے کہ ہرن چرایا تھا اس نے۔

اچھا آپ کسی شاعر کو لیجئے؛ جس کو آپ اپنا معیارِ اخلاق سمجھتے ہیں، اس معیار پر تو میرا خیال ہے شاید ہزار شاعر میں ایک شاعر نہیں اُترے گا۔ یعنی مُلّایانہ، یا پنڈتانہ معیارِ اخلاق جو ہے اس پر ایک شاعر ہزار میں بھی نہیں اُترے گا۔ ہاں وہ کچھ تھوڑے سے نعت نویس یا بھجن لکھنے والے؛ تو ایک معاملہ تو یہ ہوا۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ کہا گیا کہ تضاد سے کسی شاعر کی یا فنکار کی خوبی میں اضافہ ہوتا ہے، تو تضاد یا تناقض جو ہے وہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ شخصیت کے ارتقاء کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یعنی ظاہر میں وہ تضاد نظر آتا ہے۔ میرا وہ خیال اب نہیں ہے جو پندرہ برس کی عمر میں تھا، اور اگر واقعی وہی ایک خیال ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میرا ذہن اسی قسم کا ہے جیسے کہ بچوں کا ذہن ہوا کرتا تھا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ پندرہ برس کی عمر میں تم نے یہ رائے ظاہر کی تھی؛ اور آج جب تم ستر برس کے ہو یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہو، دوسری رائے ظاہر کر رہے ہو' اور' جو متضاد ہے؛ تو یہ تضاد نہیں ہے یہ شخصیت کا ارتقاء ہے۔ لیکن یہ کہ پختگی آنے کے بعد اگر متضاد اور متناقض خیال ظاہر کیا جائے تو یہ بڑی خامی کی دلیل ہے۔ خواہ وہ شاعر ہو یا فلسفی ہو یا سیاست پیشہ ہو۔ ورنہ پھر ان لوگوں کو جو صبح کو کانگریس میں ہیں' اور دوپہر کو کرانتی دل میں' اور پھر شام کے وقت جو ہیں وہ کمیونسٹ ہیں، اور پھر دوسرے دن جو ہے وہ پھر کانگریس میں واپس آئے۔ ان سب لوگوں کے متعلق ہم کچھ بھی، مطلقاً شکایت نہیں کر سکتے۔ اور کم از کم میں ایسے لوگوں کو نہایت ذلیل انسان سمجھتا ہوں۔ اچھا تو یہ تناقض اور تضاد کا معاملہ ہوا۔

جہاں تک غالب کی شخصیت کا تعلق ہے کوئی اہم معاملہ ایسا نہیں ہے کہ جس کے متعلق متفادت رائیں انھوں نے نہیں ظاہر کی ہوں۔ صرف ایک مثال دوں گا اس وقت۔

ایک نہیں بیس جگہ انھوں نے اپنے کو اثنا عشری لکھا

ہے۔ اچھا پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

کیا ہے وہ شعر ــــــــــ

[مالک رام: شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری]

شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

ان کا ایک خط غمگین کے نام موجود ہے جس میں انھوں نے تشیع اور تسنن میں RECONCILE کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات پیش کی ہے انھوں نے کہ امامت مختلف چیز ہے اور خلافت مختلف چیز ہے۔ خلفائے ثلاثہ کو خلافت تو نصیب ہوئی، لیکن یہ کہ وہ امام نہ تھے۔ لیکن بیک وقت ایک دوسرا شخص امام رہ سکتا تھا۔ اس لئے امامت ان سے غصب ہوئی نہیں، اور خلیفہ، حضرت علی، ان تینوں کے بعد منتخب ہوئے: اس لیے غصب کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، تو یہ ایک قسم کی کوشش کی نا، انھوں نے، ان دونوں میں۔!

اچھا۔ یہی بزرگوار ایک انھوں نے مثنوی کہی بہادر شاہ کی طرف سے۔ اس مثنوی میں انھوں نے رفض کو سودائے خام وغیرہ کہا۔ پھر ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں یہ کہ مذہب تشیع میں تو سب صحابہ جو ہے یہ مستحسن بلکہ واجب ہے۔ اور خود اپنے کو وہ شیعی کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ (اچھا) سمجھتے ہیں۔

اچھا۔ آگے چلئے۔ ایک قطعہ ہے ان کا موجود جس میں معلوم نہیں اس کا ممدوح کون ہے، لیکن قرینہ یہ ہے کہ کوئی شیعی امیر اس کا مخاطب ہے۔ اس میں چار عیدوں کی مبارک باد دی ہے جس میں سے ایک عید بابا شجاع کی عید بھی ہے۔ آپ لوگوں میں سب کو معلوم نہیں ہوگا کہ عید بابا شجاع کس کو کہتے ہیں۔ تو بابا شجاع سے مراد جو ہے وہ ابو لولو ہے وہ خلیفہ ثانی کا قاتل! تو کچھ اثنا عشری حضرات ایسے ہیں جو اس عید کو عید کے طور سے CELEBERATE کرتے ہیں۔

ہیں، آپ لوگوں میں سے جو مجھ سے واقف ہیں، غلط فہمی نہ کریں۔ میں نہ شیعہ ہوں نہ سنی، بلکہ میں، میرا کوئی مذہب نہیں ہے۔ اس لئے یہ نہ سمجھیے کہ میں تعصب پھیلانا چاہتا ہوں۔ لیکن معلومات کو ان کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور جب یہ خود دیکھتا ہوں تو یہ بھی چاہتا ہوں تو دوسرے لوگ بھی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔

تو اگر آپ پسند کرتے ہیں اس قسم کے تضاد و تناقض کو تو کم سے کم میں تو اس سے دو چار سو کوس دور رہنا چاہتا ہوں۔ تو یہ معاملہ تو تناقض و تضاد کا ہو گیا۔

شاعرانہ عظمت کا جو معیار ہمارے ڈاکٹر صاحب (عابد حسین) نے بیان کیا ہے، بڑی حد تک صحیح ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے اور اس پر کچھ اضافہ ــــــــــ

ایک بات یہ بھی ہے کہ ابھی غالب کو بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ یعنی سو برس ہوئے ہیں اور غالب کے کلام کا دوسری زبانوں میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ اور مغرب کے کچھ لوگوں نے اگر اس سے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کیا ہے تو وہ نقاد نہیں ہیں بلکہ اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے ہیں یعنی مستشرقین۔ اور استشراق اور نقادی یہ دونوں ایک چیز نہیں ہیں، یعنی بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ مختلف یورپین زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اعلیٰ درجے کے نقاد اسے تسلیم کریں کہ: اعلیٰ درجے کا شاعر ہے غالب، اور پھر مدت دراز تک اس کی تصدیق ہوتی رہے، جب جا کر یہ پتہ چلے گا کہ غالب واقعی بڑا شاعر ہے یا نہیں ہے۔

اچھا۔ آگے چلئے۔ اب مثلاً یہ کہ ہومر سے لیجئے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم میں سے ہزاروں نے اس کو نہ پڑھا ہو، لیکن کون آدمی ایسا ہے پڑھا لکھا، جو ہومر سے واقف نہیں ہے۔ کونسی متمدن مہذب زبان ہے جس میں اس کا ترجمہ موجود نہیں ہے۔ جس وقت سے کہ اس کا ترجمہ مختلف یورپین زبانوں میں ہوا، اس پر عام طور پر اتفاق ہے کہ وہ دنیا کے بڑے شعراء میں تھا۔

علیٰ ہذا یونانی ڈرامسٹ ہیں۔ حالانکہ بڑا بُعد ہے۔ مَعاشرت کا فرق ہے، زمانے کا فرق ہے، لیکن یہ آج بھی زمانہ، اُس زمانے کے جو یونانی ڈرامہ نسٹ ہیں، اُن کی عظمت کا قایل ہے۔ بلکہ آج تک انگلستان میں نئے ترجمے ہوتے ہیں۔ اور پھر اسٹیج بھی۔

تو یہ ہے عظمت! مگر ان کو، کسی کو ڈھائی ہزار برس کا زمانہ گذر چکا ہے، کسی کو دو ہزار کا زمانہ گذر چکا ہے۔

زمانہ حال کے مطابق بھی لیجیے کہ یورپ کے مصنّفین ان کی کتابوں کا ترجمہ مختلف یورپی زبانوں میں ہو جاتا ہے۔ مثال سامنے ہے، ڈاسٹوسکی ہے، چیخوف ہے، یا جرمن شعرا میں گوئٹے ہے، ہائنے ہے، اس قسم کے جرمن شعرا ہیں؛ فرانسیسی شعرا ہیں، تقریباً تمام یورپی زبانوں میں ان کا ترجمہ موجود ہے؛ اور نقاد بالاتفاق ان کی عظمت کے قائل ہیں ——— یا کچھ لوگ ہیں؛ اب یہ ظاہر ہے کہ یکساں تو ہو نہیں سکتا ہے خیال۔!

تو غالبؔ کے ساتھ یہ معاملہ گذرا کم ہے۔ اَب رہا ہندوستانی نقاد، تو میں ان کی نقادی کا بالعموم قائل نہیں ہوں۔ بہت قلیل مطالعہ (ہوتا ہے) اِن کا! بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جن کی وسعتِ مطالعہ کا، اور جن کی دقّتِ نظر کا میں قائل ہوں۔ لیکن بہت بڑی تعداد نقّادین کی ایسی ہے جن کو میں نقاد سرے سے سمجھتا ہی نہیں۔ تو پھر، میں اپنی رائے ظاہر کر رہا ہوں، جب میں سمجھتا ہی نہیں تو پھر ان کی رائے کا وزن ہی کیا ہو سکتا ہے۔

تو ابھی تک اس بات کا پتہ نہیں چلا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ میں خود بھی غالبؔ کے کلام کو ایک مدّت دراز سے پڑھتا آرہا ہوں۔ ایک زمانہ میں مجھے غالبؔ کا پورا دیوان، اپنے الفاظ کو مجھے واپس لینا چاہئے، پورا دیوان نہیں لیکن یہ کہ غزلیں؛ شاید ہی کوئی ایسا شعر ہو جو مجھے یاد نہ ہو۔ اور یہ کثرت مزاولت کی وجہ سے یہ نہیں کہ میرا حافظہ بہت قوی ہے، کہ ایک مرتبہ پڑھا اور یاد رہ گئی بات۔ یہ بات نہیں تھی؛ بلکہ اتنی مرتبہ میں نے دیوانِ غالب پڑھا تھا کہ تقریباً شاید ہی کوئی شعر ہو جو مجھے یاد نہیں ہو، یعنی جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے۔ اب حالانکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ اور بھی دیکھتا رہتا ہوں۔ مگر اتنا حافظہ قوی نہیں رہا، عمر کی وجہ سے۔ بہرصورت تو مطلب یہ ہے کہ میں آخر کوئی اسکالر کی حیثیت سے نہیں پڑھتا تھا۔ میں جو اس زمانے میں غالبؔ کے کلام کا اس قدر کثرت کے ساتھ مطالعہ کیا کرتا تھا، تو ایک اسکالر کے نقطۂ نظر سے نہیں۔ نہ میری یہ غرض تھی کہ اس کی خوبیاں لوگوں کو ظاہر کروں یا بُرائیاں۔ یہ نہیں۔ بلکہ، یہ کوئی چیز تھی اس کی جو مجھے اپیل کرتی تھی۔ اور دوسرے شعرا میں وہ بات نہیں تھی: اُردو کے دوسرے شعرا میں نہیں تھی۔ اور اگر تھی تو کمتر درجے میں تھی۔ یا یہ کہیے کہ اس زمانے تک ان لوگوں کے کلام تک میری رسائی نہیں ہوئی تھی۔ یہی سب POSSIBILITIES ہیں۔ بہرصورت اگر میں نہ سمجھتا خود، غالبؔ کو، ایک بڑا شاعر، تو اپنا اتنا وقت اس پہ صرف نہیں کرتا۔

اس کے بعد جب مجھے کچھ ریسرچ کا شوق ہوا، تو میں نے غالب کا ایک ایک لفظ پڑھا۔ یعنی وہ چیزیں چھوڑ دیجیے جو کہیں چھپی نہیں ہیں۔ اور کسی خاص شخص کے قبضہ میں ہیں، اور میری رسائی اب تک نہیں ہوئی ہے۔ اُسے اگر آپ چھوڑ دیجیے تو کوئی چیز ایسی نہیں ہے، غالب کی، جسے بار بار میں نے نہیں پڑھا۔ اور بہت سے معاملات تھے جن سے متعلق اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ ایک وہی شخصیت کا معاملہ تھا غالبؔ کا جس کے متعلق مجھے بہت کچھ اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔

کچھ تھوڑی سی بات فارسی کے متعلق بھی کہہ دوں۔

مسٹر فخرالدین علی احمد جب ایران گئے تھے تو شہنشاہ ایران سے کہا تھا: نہیں؛ مجھ سے پہلے ان سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے کہا میں ایران جا رہا ہوں، میں وہاں کہوں گا لوگوں سے کہ دیوان

غالب شائع کریں، دیوان فارسی! تو میں نے کہا، دیکھئے، ایران کے لوگ ان کی فارسی کے چنداں قدرداں نہیں ہیں، اس لئے نہ کھپے گا۔ مگر یہ کہ، انھوں نے میرے مشورے کو نہ مانا۔ وہاں گئے، اور شہنشاہ ایران سے براہ راست گفتگو کی، اور شہنشاہ ایران نے وعدہ کیا کہ وہ ان کا دیوان شائع کریں گے۔ رات مجھ سے گفتگو ہو رہی تھی، تفضلی صاحب سے۔ رات سے قبل کی رات۔ میں نے پوچھا کیا ہوا، صاحب! وہ دیوان چھپ رہا ہے؟ فرمانے لگے: صاحب! دیوان چھپ کر کیا ہوگا؟ دیوان پڑھتا کون ہے؟ کس شاعر کا دیوان ایران میں پڑھا جاتا ہے سوائے دو چار شاعروں کے؟ اور میں تو انتخاب کا قائل ہوں۔ اور اگر زیادہ کلام شائع ہوا تو لوگوں کو اور بھی بداعتقادی ہو جائے گی۔

کیوں، صاحب؟ صاحب، انگریزوں کی مدح سرائی کرتے تھے؛ سکھوں کو جو شکست ہوئی تو اس پر مبارک باد کا ایک قصیدہ لکھا۔ یعنی یہ سب CHARGES ہیں غالب پر۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ اس کا شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔

خیر، صاحب! الغرض یہ کہ انھوں نے کہا کہ اب ایران میں دوسری طرز ہے۔ میں نے کہا کہ جناب! فارسی زبان تو آپ کی ہے! اس زبان میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں، یا اسکے مختلف علاقوں DIALECTS بولے جاتے ہیں، ان معاملات کے اندر یقیناً آپ کی واقفیت جو ہے ہم لوگوں سے بہت زیادہ ہے؛ لیکن جہاں تک افکار کا تعلق ہے، نفسِ شاعری کا تعلق ہے، ہم لوگ بھی ویسے ہی رائے قائم کر سکتے ہیں جیسے آپ کسی ایرانی شاعر کے متعلق۔ اس میں آپ کی SUPERIORITY تسلیم کرنے کے لئے مطلقاً تیار نہیں ہوں۔ جیسے آپ بھی یہی کہہ سکتے ہیں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ، بھئی! ہم بھی کسی اردو شاعر کے متعلق، انیس کے متعلق یا غالب کے متعلق یا نظیر کے متعلق رائے قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں؛ میں کہوں گا یقیناً رکھتے ہیں آپ، بشرطیکہ آپ زبان سے واقف ہوں، اس زبان کے لٹریری TRADITION سے آشنا ہوں۔ تو ہم لوگ ایک ہزار برس سے فارسی شاعری سے تعلق رکھنے کے بعد بھی اگر اس کے TRADITION سے واقف نہیں ہیں تو یہ تو بڑی زیادتی ہوگی ان کا یہ سمجھنا۔

اصل میں معاملہ کچھ یہ ہوا کہ ہمارے غالب کے پیشِ نظر جو کلام رہا، زیادہ تر، وہ صفوی عہد کے شعراء کا تھا جس کا خاتمہ ہوا حزیں پر۔ یہ طرزِ شاعری جو ہے وہ بعد کو ایران میں مقبول نہیں رہا۔ وہ سادگی پسند آئی، اور اس کے بعد پھر آذر وغیرہ تھے۔ غالب کو جو ایک چھوٹا موٹا REVOLUTION جو ہوا تھا ایران میں، اس کی مطلقاً خبر نہ تھی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ عہد قاچار، جو مجمع الفصحا کے عہد کی شاعری ہے، قاآنی جس کا سب سے مشہور REPRESENTATIVE ہے، اب یہ لوگ واپس گئے منوچہری اور فرخی وغیرہ کی طرف۔ غالب نے حالانکہ تھوڑا بہت قاآنی کا کلام دیکھا تھا مگر ان کے فارسی کلام میں کہیں بھی اس کا نشان نہیں ملتا کہ وہ اس سے کسی حد تک بھی متاثر ہوتے تھے۔ تو یہ ایک جزِ معترض ——————

اور پھر اس کے بعد مغربیت آ گئی، ایران میں۔

تو غالب کا اسلوبِ شاعری جو تھا تا، تو ان چیزوں سے بہت مختلف تھا۔ اور ایک متروک طرز تھا۔ تو وہ متروک طرز جو ہے، آج کل مقبول طرز کس طرح ہو سکتی ہے۔ اور ہمارے یہاں اس قسم کا انقلاب ہوا نہیں، جیسا ان کے یہاں ہوا تھا۔

یہ وجہ ہے جو وہ کہتے ہیں کہ ہمیں پسند نہیں ہے جو ایسا کہتے ہیں انھوں نے صائب کے متعلق لکھا ہے، وہی مجمع الفصحا آذر نے لکھا ہے: "طرز نکوئی ندارد" حالانکہ صائب کا کلام اب پھر ایران میں مقبول ہونے لگا ہے۔ اس کا انتخاب کیا، پورا دیوان شائع ہوا ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی: قاضی صاحب! ایک خیال کہیں دیکھا لکھا

ہوا کہ تاریخ ادبیات فارسی جسے ہم کہتے ہیں، اس سے پورے طور سے غالب واقف نہیں تھے، مطالعہ نہیں کیا تھا انھوں نے گہرا مطالعہ جسے کہتے ہیں۔ معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے، کسی کا STATEMENT ہے]

قاضی صاحب: یہ میرا بھی STATEMENT ہے، اور بالکل سو فیصدی صحیح STATEMENT ہے جس کو میں پوری طرح ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں جب آپ زحمت فرمائیں، میں آپ کو SATISFY کردوں گا۔

[مگر کیا قاضی صاحب، غالب کے بڑے شاعر ہونے میں اس سے کچھ کمی آجائے گی اگر انھوں نے فارسی زبان کا پورا احاطہ نہیں کیا]

قاضی صاحب: رات ہی میں نے ایک بروشیور کے لئے تھوڑی سی مختصر عبارت لکھی جس میں آخری جملہ یہ تھا:

"That on occasions his theory is not in consonance with his practices and that he is not as great a Persian scholar as he claims to be, this does not detract much from his greatness as a literary artist."

تو میرا بھی یہ خیال ہے شاعر کے لئے GRAMMARIAN ہونا کیا ضروری ہے۔ ظاہر ہے یہ کہ اتنی حد تک زبان جاننی ضروری ہے کہ وہ اسے استعمال کر سکے لیکن GRAMMER کی Intricacies سے اس کی واقفیت مطلقاً ضروری نہیں ہے۔ گویا LEXICOLOGIST نہیں ہے جو لفظوں کی تحقیق کیا کرے۔ ارے، شاعر تو بالطبع ذرا بہت ہی بے صبر قسم کا آدمی ہوتا ہے، اس سے یہ اتنی محنت کہاں ہوگی۔ اور ہرگز اس کی شاعرانہ عظمت میں کمی نہیں آتی ہے اگر دو سو جگہ پر بھی غلطی کرے۔

جیسی شاعری وہ کرتے تھے اس کے لئے کافی ہے۔

[**عابد حسین:** اور ان کی زندگی جن حالات میں گذری ہے، اُسے بے چارے کو کہاں موقع ملتا کہ وہ ———

قاضی صاحب: کہاں موقع ملتا! اور یہ ان کی غلطی تھی کہ انھوں نے قاطع برہان کی سی کتاب لکھی۔ اور وہ خود کہتے ہیں کہ ——— جس وقت میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں میرے پاس دساتیر اور برہان قاطع کے سوا کوئی کتاب نہیں موجود۔ کسی ڈکشنری کی آپ [illegible] کریں، اور [illegible] بھی اس نوع کا کہ صاحب فلانا لفظ کسی نے استعمال ہی نہیں کیا ہے، دنیا میں کسی بھی جگہ نہیں پایا جاتا ہے سوائے برہان قاطع کے، تو یہ تو اپنے ساتھ ظلم کرنا ہے۔ اپنے ساتھ ظلم کرنا ہے۔ بڑی آسانی کے ساتھ ان کے مخالفین نے یہ بات ثابت کردی کہ پچاسوں جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

تو کسی بھی شاعر کے لئے مورخ ادب یا GRAMMARIAN ہونا ضروری نہیں ہے۔ کسی شخص نے ہومر کا نیا ترجمہ کیا۔ میتھو آرنلڈ صاحب نے اس پر کچھ اعتراضات کئے۔ وہ شخص جو تھا ان سے یونانی زبان کہیں زیادہ جانتا تھا۔ تو اس نے اس پر پھر جو مضمون لکھا، آرنلڈ نے، تو وہ اس میں لکھتا ہے کہ اسکالرشپ میں تو میں ان کا بالکل مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر میں سمجھتا ہوں کہ جتنی یونانی میں جانتا ہوں وہ بھی شاید APPRECIATION میں خلل انداز ہوتی ہو۔ میرا یہ VIEW نہیں ہے، مگر ایک بڑا نقاد کا یہ VIEW ہے۔

[**گوپال متل:** تو قاضی صاحب آپ نے عالمی ادب کی بات رکھی۔ اردو فارسی کی جو شاعری ہے، یا کم سے کم محدود حد میں اس میں آپ غالب کو کیا مقام دیتے ہیں؟]

قاضی صاحب: اردو میں ایک عظیم شاعر ہے۔ عظیم شاعر ہے بلاشبہ! (رہی فارسی) میرا خیال یہ ہے کہ مختلف درجے ہیں نا فارسی شاعری کے۔ فارسی شاعری کی عمر ہے ہزار سال سے زیادہ اب اگر آپ ان کا مقابلہ کیجئے گا فردوسی سے، غلط بات ہوگی۔ کیونکہ یہ بالکل مختلف طرزِ شاعری ہے۔!

[ایک آواز: EPIC]

قاضی صاحب: جی ہاں، اور غالب جو ہیں انھیں LYRICAL ہی کہیں گے آپ اردو کے شاعر کو، اور کیا کہیں گے۔!

——— ہاں، ایک بات یہ بھی کہی گئی تھی، کہ غالب کے یہاں فارسی کے اشعار کا ترجمہ ہے۔ تو ترجمہ بھی، اگر وہ شاعر اس بات کا دعویٰ کرے کہ مضمون میرا ہی پیدا کردہ ہے، اور چیلنج کا،

تو یہ تو ظاہر ہے یہ کہ صحیح نہیں ہے دعویٰ، بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ اس کی نظر سے یہ شعر گذرا ہے۔ لیکن یہ ایک زبان سے دوسری زبان میں اس طرح کسی مضمون کو منتقل کر لینا کہ اس میں ایک اعلیٰ درجے کی شعریت پیدا کی جائے، یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔ اور یہ بجائے خود فن ہے۔ چنانچہ یہاں تک لوگوں نے کہا ہے، ایمرسن کا قول ہے، کہ،

"Next to the writer of a good sentence is the first quoter of it"

آمدے بریتیاں جو سوریالسٹس کا لیڈر ہے، اور ہربرٹ ریڈ جو اس کا انگلستان کا Counter part ہے یہ لوگ یہی کہتے ہیں کہ Quotation کرنا بھی بجائے خود ایک CREATIVE ہے۔

[عابد حسین: ہاں یہ تو مقالہ نگار نے بھی کہا ہے]

بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں، سوریلسٹ، کہ مثلاً آپ سمندر کے ساحل پر چلے جایئے، وہاں پر چھوٹے چھوٹے PEBBLES ہوتے ہیں، کوئی گھونگا ہوتا ہے۔ اگر آپ اس میں سے SELECT کر کے لے آیئے کسی کو جس میں کوئی خوبصورتی ہو، تو یہ بھی ایک WORK ہے، تو جب یہ WORK ہو سکتا ہے تو پھر یہ کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں شعر کا، کسی مضمون کا منتقل کرنا کیوں نہیں۔

اور پھر غالب نے یہ نہیں کیا ہے کہ بالکل ترجمہ کر لیا ہو، ایسا بہت کم کیا ہے۔ عام طور پر کچھ نہ کچھ فرق اس میں پیدا کر دیا ہے۔

[عابد حسین: صحیح ہے، کوئی نہ کوئی خوبی پیدا کر دی ہے اس نے]

کوئی نہ کوئی خوبی پیدا کر دی ہے، اور ایک نیا پہلو پیدا کر دیا ہے اُس مضمون کا۔

[نقوی: میں اپنی معلومات کے لئے ایک بات دریافت کرنا چاہتا تھا۔ غالب کا ایک شعر ہے کہ:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کسی شاعر کا، مجھے نام یاد نہیں لیکن، وہ شعر یاد ہے، وہ کہتا ہے:

اے گل چو آمدی ز زمیں، گو، چگونہ اند
آں ....]

ٹھیک ہے، اپنی جگہ پر وہ بھی شعر بہت اچھا ہے۔

[نقوی: مگر چونکہ اس نے کنایہ رکھا ہے اس لئے اس میں لطف زیادہ ہے۔ غالب نے چونکہ صراحتاً بیان کر دیا ہے اس لئے ———

عابد حسین: نہیں، غالب کے یہاں بھی دیکھئے، سب کہاں کچھ!]

قاضی عبدالودود: کیا صورتیں ہوں گی۔!

[عابد حسین: جی ہاں، کیا صورتیں۔!]

قاضی عبدالودود: رہی آئین اکبری کی تقریظ کی بات تو وہاں تو مطلب یہ ہے کہ یہ خاکسار موجود ہے، اس خاکسار کے موجود ہوتے

ہوتے آپ ابوالفضل کی طرف کیوں جائیں۔ اب رہا یہ کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے نا، کہ انگریزوں کے آنے کی تعریف ہے تو سرسید یہ کب لکھ رہے ہیں آئین اکبری میں کہ وہ آئین جو تھا بہتر تھا۔ اب رہا یہ کہ غالب کا کچھ ایسا خیال معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ ہی بالکل [دوسری چیز] ہے صرف زمانۂ حال میں سروکار رکھیے اور ماضی پر لعنت بھیجیے۔ یعنی کم از کم اس تقریظ سے یہی ـــــ حالانکہ یہ بالکل غلط بات ہے۔

[ضیاء الحسن فاروقی : حالانکہ وہ خود اس زمانے میں تاریخ لکھ رہے تھے]

قاضی صاحب : تو، تاریخ تو وہ کہتے ہیں کہ ایسا موضوع ہے کہ جو میری سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ حالانکہ فلسفیانہ تاریخ لکھی جاتی وہ امرِ دیگر ہے، لیکن معمولی تاریخ جو ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتی؛ اور یہ مواد جو ہے جو مہر نیم روز کے لئے ہے، وہ دوسرے لوگ بھیج دیتے ہیں، کتابوں سے اخذ کر کے؛ میں اپنی عبارت میں پیش کر دیتا ہوں۔ بادشاہ کو خوش کرنا مقصود ہے۔ تو اس سے وہ مورخ تو نہیں ہو سکتے!

[نقوی صاحب : ہمارے عابد حسین صاحب نے ایک بات کہی تھی کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ وہ بڑی ہو گئیں۔ اس نے باقاعدہ ارادہ اور قصد کر کے نہیں کہا۔ اور وہ خود کہتا ہے:

شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن ـــ اس بارے میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ـــــ]

قاضی صاحب : آپ نے تو خطوط اردو کے بارے میں کہا تھا!

[عابد حسین - جی ہاں! کچھ خطوط تھوڑے سے، آسان اور سہل جو انھوں نے یہ سمجھ کر نہیں کہے۔]

اور "شہرتِ شعرم" جو اس نے کہا ہے میرا خیال ہے فارسی کلام کے بارے میں کہا ہے۔

قاضی صاحب : اچھا پھر یہ کمال ہے اسی غزل میں آگے جو شعر کہے اسی کا ایک یہ ہے کہ،

دفترِ اشعار بابِ سوختن خواہد شدن

یعنی کیا ایک رہے ہو غالب! زمانے کی روش تو ایسی ہے کہ تم یہ کہہ رہے ہو شہرت ہوگی، زندگیٔ جاوید حاصل ہوگی۔ ارے تمہارے اشعار کا دفتر جلا دیا جائے گا۔ اور خدا جانے اور کیا کیا کہا ہے، لمبی داستان ہے اس کی۔

[عابد حسین : ہاں خیر، یہ تو آدمی پہ مختلف کیفیتیں گزرتی ہیں]

○

رہا عامتہ الناس کے لئے شاعری کا معاملہ تو میرے خیال میں تو غالب کی شاعری اس کے برعکس HIGHLY SOPHISTICATED کی شاعری ہے، اس کی سوسائٹی SOPHISTICATION کے جس درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔ پھر یہ کہ، معمولی بات کو بھی اس انداز سے کہتا ہے جیسے آسمان سے بات کر رہا ہے۔ اب وہ کیا شعر ہے: "نقش پا پایا" اس کا کیا مطلب ہے (مرتب: عدم سے پرے والی بات) ہاں، یہی۔ مگر امکان سے پرے، عدم سے، یعنی کیا! لیکن یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی بہت ـــــ

ایک بات اس کے یہاں یہ بھی ہے کہ فکر ہے۔ اسے آپ SPECULATIVE تو نہیں کہہ سکتے لیکن LOGICAL ضرور ہے۔ اس کے ساتھ ایک اہم چیز SENSE OF HUMOUR ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اب وہ کیا شعر ہے:

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

اس میں جو IRONY ہے وہ ـــــ

پھر، اس کے اشعار PICTORIAL ہوتے ہیں۔

(اور آخری بات یہ کہ) فارسی کی ترکیبیں بھی، ان کا استعمال بھی، اس کی شاعری کو (اہم بناتا ہے)

●●